ہندوستان مین زراعت کا مسئلہ } ازجناب ڈاکٹر زین العابدین احمد صاحب، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۶۲ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت :- ۴ر

پتہ :- مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

اس مختصر رسالہ مین ہندوستان مین زراعت کی ابتری اور کسانون کی تباہ حالی کے اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے، تمہید مین دکھایا گیا ہے، کہ ہندوستان ہمیشہ سے زرعی ملک نہ تھا، بلکہ صنعت و حرفت مین بھی اس کا حصہ تھا، ہندوستان سے خام پیداوار کے حصول اور یہان ولایتی مصنوعات کی کھپت کے لئے عمداً اسے زرعی بنایا گیا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے، کہ آج ملک کے بڑے حصہ کی زندگی کا مدار زراعت پر ہے، اس کے بعد کاشتکارون کی تباہی کے اسباب زمین کی قلت، کاشتکارون کی کثرت، کھیت کے رقبون، کسانون کی محنت واخراجات زراعت کے مقابلہ مین پیداوار اور ہندوستان کی اوسط آمدنی کی غیرمعمولی کمی، دیہی قرضون کی تباہیان، حقیت اراضی کے قوانین کے بُرے نتائج وغیرہ، تمام اسباب کو مع اعداد وشمار کے دکھایا گیا ہے،

وداع راشد، ازجناب رازق الخیری صاحب، تقطیع اوسط، ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مرقوم نہین، پتہ دفتر عصمت دہلی،

مولینا راشد الخیری کی وفات پر ان کے فرزند جناب رازق الخیری صاحب نے یہ مضمون مائچ ۱۹۳۶ء کے عصمت مین لکھا تھا، جسے اب کتابی شکل مین شائع کردیا ہے، اس مین مولینا مرحوم کی علالت اور وفات کے تفصیلی حالات ہین، مرحوم کی شخصیت کے اعتبار سے یون بھی یہ ایک یادگار مضمون ہے، پھر نامور باپ کی وفات کے حالات کو دردمند بیٹے کے قلم نے قدرةً موثر بنا دیا ہے، اسلئے یہ مضمون مختلف حیثیتون سے سبق آموز اور مطالعہ کے لائق ہے،

"م"

جلد ۴۵ "ماہ صفر المظفر ۱۳۵۹ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۴۰ء" عدد ۴

مضامین

شذرات

مولانا **شبلی** مرحوم نے آج سے ستاون برس پہلے ۱۸۸۳ء مین اپنے وطن اعظم گڈہ مین انگریزی کا ایک اسکول اس غرض سے قائم کیا تھا کہ اس ضلع کے لوگ جو نئی تعلیم سے ناآشنا ے محض تھے ان کے لئے گھر بیٹھے تعلیم کا سامان ہو، اس وقت تک اعظم گڈہ مین صرف ایک عیسائی مشن اسکول کے سوا کوئی دوسرا اسکول نہ تھا، مولانا نے اپنے اس اسکول کا نام **نیشنل** رکھا تھا، اور اسی نام سے انھون نے اپنے مکتوبات اور بعض قصیدون مین اس کا ذکر کیا ہے، جب تک مولانا نے ندوہ کو ہاتھ مین نہین لیا ان کی ہر قسم کی تعلیمی کوششون کا یہ مرکز رہا، اس کیلئے کثیر رقمین اپنے پاس سے اپنے دوستون سے عزیزون سے اور اپنے خاندان کے بزرگون سے حاصل کیں، یہانتک کہ یہ ہائی اسکول کے درجہ تک پہنچا،

مولانا جب اور طرف متوجہ ہوے تو یہ اسکول بعض ایسے ہاتھوں مین پہنچ گیا جس نے سیرت تو سیرت اس کی صورت تک مسخ کردی اور اس کا نام جارج ہائی اسکول کردیا، ۱۹۱۴ء مین اپنے بھائی مولوی اسحاق صاحب وکیل کی وفات کے بعد جب مولانا نے پھر اعظم گڈہ مین قیام کیا تو پھر اس اسکول کو اپنے ہاتھ میں لیا، مگر ابھی اس تغیر و اصلاح پر چند ہی مہینے گذرنے پائے تھے کہ نومبر ۱۹۱۴ء میں انھوں نے وفات پائی، اس دوہرے سانحہ نے ان کے پس ماندون مین اس اسکول کی ترقی کا نیا جذبہ پیدا کردیا، اور اسکول جو ہائی اسکول سے بھی نیچے گرچکا تھا سنبھل کر

پھر آگے بڑھا اور اس کا نام شبلی جارج اسکول رکھا گیا، اور اب اسی نام سے روشناس ہے،

اس وقت اسکول کا کام چند ایسے مخلص کارکنون کے ہاتھون میں تھا جنھوں نے پوری محنت اور خلوص سے اس کی ترقی کے لئے کام کیا، اس کی شاندار عمارت بن گئی، بہت سے نئے کمروں کا اضافہ ہوا، بعض نئے کلاس کھلے، اسٹاف بھی قابل محنتی اور اخلاص شعار جمع ہوگیا جس نے اپنی ان تھک کوششوں سے اسکول کے نام کو روشن کیا اور افسران تعلیم کی نگاہوں میں اسکی یہ وقعت بڑھائی کہ اب یہ ہائی اسکول سے بڑھکر انٹرمیڈیٹ کالج بن رہا ہے،

اس نئے کالج کے ولولہ نے جو اس شہر میں تعلیمی ترقی کا پہلا نمونہ ہے پورے ضلع میں خوشی و مسرت کی لہر دوڑا دی ہے، مولانا مسعود علی صاحب ندوی کی پرجوش رہنمائی میں شہر کے ممتاز وکلا، اور کارکن پورے ضلع میں دوڑ رہے ہین، اور اس بات کا عہد باندھے ہوے ہین کہ جولائی میں اس کالج کی عمارت بنکر تیار ہوجائے گی.

اس سلسلہ میں ۳۱ مارچ ۱۹۴۰ء کو کالج کے سنگِ بنیاد کی تاریخ مقرر ہوئی، جناب نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی جن کو مولانا شبلی مرحوم کے علمی و تعلیمی کارنامون سے جو دلچسپی ہے وہ سب کو معلوم ہے، زحمت فرما کر اعظم گڈہ تشریف لائے، اور اپنے ہاتھون سے سنگِ بنیاد نصب فرمایا، اس سنگِ بنیاد کے جلسہ میں مختلف مؤثر نظمین پڑھی گئیں اور دلنشین تقریریں کی گئیں۔

مولانا ممدوح نے تین روز دار المصنفین میں قیام فرمایا، اور دار المصنفین میں جو نئی ترقیاں ہوئی ہیں ان کو ملاحظہ فرمایا، باہر سے آنے والے دوسرے مہمانوں میں مولنا عبد الباری صاحب ندوی پروفیسر جامعہ عثمانیہ تھے، جنکو جامعہ عثمانیہ نے خاص اس غرض سے بھیجا تھا، اور مولوی اکرام اللہ خاں ندوی اسسٹنٹ سکریٹری مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈہ، اور مولوی حافظ محمد عمران خان ندوی ازہری نائب مہتمم

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ تھے)

انگلستان کے مشہور مستشرق پروفیسر مارگولیوتھ نے ۸۲ برس کی عمر میں وفات پائی، پہلے یہودی تھے، پھر عیسائی ہوگئے تھے، اس سے ظاہر ہے کہ ان کو اسلام اور پیغمبر اسلام علیہ السلام سے اکہری نہیں بلکہ دوہری عداوت تھی، ان کی عمر بھر کا سرمایہ اسلام پر مہذب غارتگری ہے، اور یہی سبب ہے کہ خود یورپ کے سنجیدہ طبقہ میں بھی وہ احترام کی نظر سے نہیں دیکھے گئے، ان کی سب سے بڑی کتاب، آنحضرت صلعم کی سیرت ہے جس کو دیکھکر مولانا شبلی مرحوم بے چین ہوگئے تھے اور اپنی سیرت نبوی کی اسکیم کی بنیاد ڈالی تھی، جس نے بحمد اللہ کہ ملک میں سیرت پاک کی تالیف ونشر واشاعت کا ذوق عام کردیا،

عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد

پچھلے پرچہ میں مدرسہ نظامیہ حیدرآباد کی عمر قیاساً چالیس پچاس لکھی گئی تھی، مگر ڈاکٹر حمید اللہ صاحب حیدرآباد سے مطلع فرماتے ہین کہ اسکی عمر کا یہ ۶۵ واں سال ہے، اللھم زد فزد،

مولانا بدرالدین استاذ مسلم یونیورسٹی کا جو مضمون آثار کشمیر پر پچھلے معارف میں چھپا ہے، اس میں لکھا ہے کہ ان کو کشمیر میں اورنگ زیب عالمگیر کی کوئی یادگار نظر نہیں آئی، ڈاکٹر صاحب ممدوح لکھتے ہیں کہ مولانا نے وہاں جمعہ کی نماز جس جامع مسجد میں پڑھی ہوگی کشمیر میں وہی عالمگیر کی یادگار ہے، اور بہت بڑی یادگار ہے۔

گذشتہ مارچ میں دکن سے لوٹ کر مجھے لاہور وپشاور وبہاولپور کا سفر کرنا پڑا، اور بعض بعض مقامات پر تقریریں بھی کیں، موقع ملا تو اس کی تفصیل اگلے پرچہ میں آپ کو نظر آئے گی،

مقالات

مولانا سید سلیمان ندوی
کا
"پہلا کارنامہ"

از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن

(۴)

میری گفتگو طویل ہوتی جاتی ہے، دراز نفسیون پر کیا کرون، ان درازدستیون نے مجبور کیا، جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی امتیون کے ساتھ آج قومون نے روا رکھی ہے، اور مختلف راہون سے کوشش ہو رہی ہے، کہ جس راہ پر پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) اس قوم کو چھوڑ گئے ہین، اس سے ہٹا دیا جائے، بہرحال مسئلہ کی تفہیم کے لئے غالباً بہت کچھ کہا جاچکا، اور بے اختیاری مین کہا گیا، جو سمجھے ہوئے ہون، وہ پیش کردیا گیا، اب مین سید صاحب کے کلام کی طرف متوجہ ہوتا ہون، آپنے بھی اپنی اس کتاب مین مختلف عنوانون کے تحت مسلمانون کے اس خاص اساسی اصول اور نصب العین کی اہمیت کو مختلف پہلوؤن سے ذہن نشین فرمانے کی کوشش کی ہے، مثلاً لکھتے ہین، ایک طویل تقریر کے بعد نتیجہ کو ان الفاظ مین درج فرماتے ہین:-

"الغرض عمل کا نیک و بد ہونا تمام تر نیت پر موقوف ہے"

پھر اسی کی تشریح دوسرے لفظون مین کرتے ہین، اور یہ جتلاتے ہوئے کرتے ہین کہ اسلام کا

یہ خاص نقطۂ نظر ہے،

"اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کا مدعا نفس عمل مطلوب نہین، بلکہ وہ عمل مطلوب ہے جس کی غرض وغایت صحیح ہو، عمل قالب ہے تو صحیح غرض وغایت اس کی روح، روح نہین تو بیجان قالب کس کام کا"،

جو صرف عبادات تک انسان اور خدا کے تعلق کو محدود خیال کرتے ہین، ان کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہین،

"اسلام مین اخلاق بھی دوسری مذہبی چیزون کی طرح عبادت ہے، اسی لئے اسکی غرض وغایت بھی ہر قسم کی دنیاوی نفسانی اور ذاتی اغراض سے پاک ہونا چاہئے، اگر ایسا نہین ہے تو ان کامون مین کوئی نیکی اور ثواب نہین ہے"

اسی سلسلہ کے ایک اور مغالطہ کا ازالہ ان الفاظ مین فرماتے ہین،

"بہشت کو ایک مومن کے نیک کام کا لازمی نتیجہ ضرور بتایا گیا ہے لیکن اُسے نیک کام کی غرض وغایت نہین قرار دی گئی ہے"،

یعنی وہی بات کہ جو درخت بوتا ہے، لکڑی اور پتون کے لئے نہین بوتا، بونے کی اصل غرض تو پھل ہی ہوتی ہے لیکن اسی کے ذیل مین لکڑی اور پتون کا بھی نفع لازمی طور پر حاصل ہو جاتا ہے گیہون کی کاشت اس غرض سے دیوانون کے سوا اور کون کرسکتا ہے کہ تخم نہین بلکہ صرف بھوسا حاصل ہوگا، نتیجہ کا یہی واقعی اور دقیق فرق ہے، جو سید صاحب کے متوازن دماغ کا امتیاز ہے، عموماً اسی خیال کو مدعیان تشیخ وتصوف سے جب سنا جاتا ہے، تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآنی آیات اور نبوی ارشادات کا مضحکہ گویا مولویون کے نام سے اڑایا جارہا ہے، اسی کے مقابلہ مین بعض ظاہر پرست دیندارون کے طرز عمل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا وہ جو کچھ کر رہے ہین، اس مین مالک کی خوشنودی سے زیادہ اپنی مزدوری

کی فکر زیادہ ہے، حالانکہ پہلون مین سے کسی نے سچ کہا کہ "جس کی گذشتہ نعمتون کے شکریہ سے آدمی عہدہ برآ نہین ہوسکتا، اس پر آیندہ حقوق کون عائد کرسکتا ہے"، بسا اوقات صرف ایک گھونٹ پانی، یا درخت کی ہلکی سی چھاؤن کے لئے آدمی اپنا سب کچھ دینے کیلئے تیار ہو گیا ہے، راک فیلر مشہور سرمایہ دار نے بچھتر کرور پونڈ کا اعلان اس ڈاکٹر کے لئے کیا تھا، جو ایک بسکٹ چار کی ایک پیالی کے ساتھ چوبیس گھنٹون مین ہضم کراسکتا ہو،

اسلام مین تمام اعمال کی غایت خدا کی خوشنودی ہے

بہرحال غرض وغایت یعنی نصب العین ہی پر عمل اور کام کی جان ہے، مختلف عبارتون مین اس مسئلہ کو واضح کرنے کے بعد اب سید صاحب اس سوال پر آئے ہین کہ ایک مسلمان جب آخرت تک کو بھی اپنے عمل کا نصب العین نہین بنا سکتا، تو پھر اپنے سامنے، اپنے عمل وفعل کے سامنے آخر کس مقصد کو پیش نظر رکھے، اپنے سیدھے سادے الفاظ مین سید صاحب نے اس کا خالص اسلامی جواب یہ دیا ہے،

"اسلام مین ہر قسم کے نیک کامون کی غرض وغایت صرف ایک ہی قرار دی گئی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی ورضامندی ہے"،

اور یہی اسلام کا وہ اساسی مسئلہ ہے جس کی بنیاد پر بانداز ضرورت تفصیل سے بتایا جا چکا کہ بڑی سی بڑی نیکی بھی قطعاً بے قیمت ہو کر رہجاتی ہے، اگر وہ خدا کے لئے نہ ہو، سید صاحب اسی کی تعبیر ان الفاظ مین فرماتے ہین،

"اسی طرح اگر کوئی نیک سے نیک کام کوئی انسان صرف اپنے ضمیر کی آواز، صرف فرض یا وجدان، یا حصول مسرت یا افادہ عام کی غرض سے انجام دے مگر خدا کے حکم کی حیثیت ملحوظ نہ رکھے، تو وہ کام بھی اسلام کی نظر مین ثواب وتزکیۂ روح کا ذریعہ نہین"۔

بلکہ اگر خدا کے حکم کی حیثیت بھی ملحوظ رکھے، لیکن خدا کے حکم کی پیروی کسی دین حق دالیسا

دین جس مین شک و شبہہ کی گنجایش نہ ہو) کے توسط سے نہ کرے، بلکہ اپنی مرضی، اپنے ضمیر، اپنے وجدان
اپنے احساس فرض اپنی عقل کے حکم کو خدا کا حکم قرار دیکر خدا کے حکم کی نہین، بلکہ اپنی مرضی کی جو کہ
پیروی کر رہا ہے، اسلئے وہ اپنے کامون مین مخلص نہین ہے، اس کا کام خدا ہی کے لئے نہین ہے، پس
اسکی مزدوری بھی اگر خدا کے پاس نہ ہو، تو اسکے سوا دوسری صورت اور کیا ہو سکتی تھی، اسی مضمون کو سید
صاحب یون ادا فرماتے ہین،

"اس لئے اللہ تعالیٰ ان لوگون کو جو دین حق کے پیرو نہین ہین، اور اپنے کامون کی بنیاد اخلاص
پر نہین رکھتے، یہ کہا کہ ان کا دین و مذہب اپنی خواہش نفسانی ہے، اور ان کے سینون مین
اغراض نفسانی کے بت چھپے ہوئے ہین،

اور یہی ایک چیز تھی، جس کی تفصیل مین بوجوہ خاص مجھے تھوڑی سی "آشفتہ بیانی" مین خود بھی الجھنا
اور دوسرون کو بھی الجھانا پڑا، کیا کہا جاسکتا ہے آج اسلام کے بعض "بینات و محکمات" کو "متشابہات" بنانے
کی کوشش بعض ذمہ دارون کی طرف سے کی گئی، اسی نے اس طول بیانی پر مجبور کیا،

رکھیو غالب کو اس آشفتہ بیانی مین معاف
آج سینہ مین میرے درد سوا ہوتا ہے

سید صاحب نے قرآنی آیت

افرئیت من اتخذ الٰهه هواه — کیا تو نے دیکھا اس کو جس نے اپنا الٰہ
(جاثیہ - ۳) — (نصب العین) اپنے دل کی خواہش کو بنایا

کے مفاد صریح اور بین منطوق کو اپنے فیصلہ کی بنیاد قرار دی ہے، اسی کے ساتھ اسلام کا یہ اعلان
کہ ہر عمل کرنے والے کے آگے اس کے عمل کا نصب العین ہی سامنے آتا ہے، اسکی تائید مین بخاری کی
پہلی حدیث "انما الاعمال بالنیات" کے سوا قرآن کی آیت

من یرد ثواب الدنیا نوته — جو دنیا کے ثواب کا ارادہ کرتا ہے، ہم اسکو
منها ومن یرد ثواب الاخرة — دنیا سے دیتے ہین، اور جو آخرت کا ارادہ
نوته منها — کرتا ہے اسکو آخرت سے

کو پیش کرتے ہوئے، اس کے ثبوت مین کہ جس کے سامنے خدا نہیں ہے، خدا بھی اس کے سامنے
نہین آتا، یہ آیت پیش فرمائی ہے،

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَعْمَالُهُمْ کَسَرَابٍ — (اسلام) کے انکار کرنے والون کے اعمال
بِقِیْعَةٍ یَّحْسَبُهُ الظَّمْاٰنُ مَآءً — کی مثال اس سراب جیسی ہے، جسے پیاسا
حَتّٰٓی اِذَا جَآءَهٗ لَمْ یَجِدْهُ شَیْـًٔا، — پانی گمان کرتا ہو، لیکن جب اس کے پاس
(نور - ۵) — آیا تو اسے "کچھ نہین" پایا،

کتنا واضح اور کھلا ہوا نتیجہ بلکہ ترجمہ اس آیت کا وہی ہے جس کا دعوی کیا گیا تھا، آخر مین
حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مشہور حدیث جس مین ان مختلف عمل کرنے والون کا انجام
دکھایا گیا ہی، جنھون نے بہ ظاہر بڑے اچھے اچھے نیک کام دنیا مین کئے تھے، مثلاً دین کا علم حاصل
کیا تھا، جہاد کے فریضہ سے سبکدوش ہوئے تھے، اپنی کمائی غریبون کی امداد یتیمون کی اعانت مین
خرچ کی تھی، لیکن محض اس لئے کہ جو کچھ کیا گیا تھا، خدا کے لئے نہین کیا گیا تھا، اس لئے ان کو
کہدیا جائے گا کہ جو تمھارا مقصد تھا، یعنی دنیا مین شہرت ناموری سو فقد قیل (وہ تو کہا جاچکا) اب
خدا کے یہان تمھارے لئے کیا ہے، سید صاحب نے بڑے موثر دردناک پیرایہ میں حدیث نقل فرمائی
جس کے ساتھ حضرت معاویہ کا حدیث کو سن کر زار زار رونا اور بھی آدمی کو بیچین کر دیتا ہے،
مذہبی دائرہ سے ہٹ کر "اخلاقیات" کے متعلق جو بلند ترین عصری نظریہ کینٹ نے پیش کیا تھا
اور جس کے متعلق تکینزی نے لکھا تھا،

"یہی وہ چیز ہے جس سے اخلاقیات کو شروع سے آخر تک بحث ہوتی ہے"،

تصحیح اخلاق کے متعلق مختلف مذاہب کے اصول

سید صاحب نے اسی کے متعلق اسلام کی طرف سے
اول با آخر ہر منتہی ست

کا جان پرور نظارہ دکھا کر اب اپنی توجہ "تصحیح اخلاق" کے ہی متعلق ان "نقاط نظر" کی جانب منعطف فرمائی ہے، جو وقتاً فوقتاً دنیا کے مختلف حصون مین مختلف مذاہب کی طرف سے پیش کئے گئے ہین،

سید صاحب نے اس سلسلہ مین جو کچھ لکھا ہے، یہ تو نہین کہا جا سکتا، کہ عموماً مذاہب کے ان نقاط نظر سے لوگ واقف نہ تھے، لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہون، کہ اتنی صفائی کے ساتھ ان کا موازنہ اسلامی نقطہ نظر سے شاید آپ سے پہلے کسی نے بمشکل ہی کیا ہوگا، خصوصاً اسلامی تعلیمات کو سامنے رکھکر جن بوالعجبیون کا تماشا نظر آتا ہے، ان کی طرف آسانی سے آدمی کا ذہن منتقل نہین ہوسکتا،

آخر کون تصور کر سکتا ہے، کہ ایک طرف اسلام کی تو یہ صلاے عام کہ ایک اور صرف ایک ذہنی تغیر اور باطنی احساس (یعنی نیت اور نصب العین) کے بدل جانے سے انسانی زندگی کا رخ پلٹ جاتا ہے، اس کا ہر ادنی معمولی کام اس باطنی انقلاب کے ساتھ ہی بلند اور اتنا بلند ہوجاتا ہے، کہ اسکی قیمت خدا کی رضامندی، بلکہ اس سے بھی بڑھکر جیسا کہ سید صاحب نے ابتغاء وجہ اللہ[1] کی بنیاد پر لکھا ہے، کہ خود خداے جل و علا ہو جاتا ہے، ایک طرف اسلام کا یہ نقطہ نظر اور کتنا واضح جلی صاف کھلا ہوا نقطہ نظر کہ بیچارے میکنزی کے قلم سے بے ساختہ نکلتا چلا جاتا ہے، کہ اخلاقیات کا کام

"تمام تر ارادہ ہی کی صحیح جہت کا بتلانا ہے، جو اخلاقی احکام ہم لگاتے ہین، ان کا تعلق ارادہ ہی سے ہوتا ہے جس فعل میں ارادہ شامل نہین، اسکی اخلاقی حیثیت کچھ نہین"۔

[1] رضاے حق کے نصب العین کے سوا قرآن نے ابتغاء وجہ اللہ جس کا ترجمہ سید صاحب نے اللہ کی ذات کا چاہنا کیا ہے، اسکو بھی اسی نصب العین کی ایک بلند ترین منزل قرار دی ہے، ۱۲،

دوسری طرف ایک مذہب ہی ہے، جو کہتا ہے کہ جو بد ہے، اب اس کے نیک بننے کی کوئی شکل نہین، اسلئے کہ ہر شخص کی زندگی در اصل کسی پہلی زندگی کے ناقابل تغیر ناممکن التبدیل نتائج کی مظہر ہے، یہ ان لوگون کا خیال ہے، جو تناسخ (آواگون) کے قائل ہین، جس کے چکر مین عموماً مشرقی ممالک کے مذاہب غلطان و پیچان ہین،

اسی طرح دنیا کا دوسرا مذہب جس کے دائرہ اثر میں کہا جاتا ہے کہ عموماً مغربی دنیا کے باشندے زندگی گذارتے ہین، اس باب مین اس کا نقطہ نظر تو تناسخ والون سے بھی زیادہ عجیب ہے، ان کے یہان بد صرف اپنی بداعمالی ہی سے بد نہین قرار پاتا، بلکہ جو جرم زید کرتا ہے، اس کا بھی مجرم عمرو ٹھہرا جاتا ہے، اور اسی پر بس نہین، بلکہ اب بھی مجرم عمرو اگر اپنی بدی کی تصحیح کرنا چاہے تو اسکے لئے بکر کو سزا بھگتنی پڑے گی، خود بیچارا عمرو اس راہ میں کچھ نہین کر سکتا، صرف ارادہ اور نیت بدل دو سب کچھ بدل جائے گا، کہان یہ آسانی، اور سہولت اور کہان گناہون کی پیچ در پیچ یہ بھول بھلیان،

میرا مقصد یہ ہے جیسا کہ سید صاحب نے لکھا ہے، کہ عیسائی مذہب مین ہر آدمی کے متعلق یہ تصور کیا جاتا ہے کہ وہ گنہ گار ہی پیدا ہوتا ہے، یعنی گناہ تو آدم نے کیا تھا، لیکن گنہ گار وہ سب قرار پائین گے، جو اس جرم میں شریک نہین تھے، اور پھر اسی کے ساتھ یہ عقیدہ کہ اگر مسیح مصلوب نہ ہوتے تو انسانون کے گناہون کی بخشائش نہ ہوتی، جس کی تعبیر مسئلہ کفارہ سے کیجاتی ہے، اور کہا جاتا ہے کہ بنی آدم کی نجات کیلئے حضرت مسیح نے صلیب پر اپنے کو کھنچوایا،

اسلام کا اصول

سید صاحب نے اس صلیبی عقیدہ کے مقابلہ مین کتنی خوبی کے ساتھ اسلام کے اس نظریہ کو پیش فرمایا ہے کہ ہر آدمی اپنی ماں کے پیٹ سے معصوم پیدا ہوتا ہے، اور اس وقت اسکی فطرت پر کسی قسم کے گناہ کا کوئی داغ نہین ہوتا، مقابلہ کے بعد اس اسلامی نظریہ کی قیمت کتنی گران ہو جاتی ہے، اسکے ثبوت مین آیات قرآنی،

(۱) فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا،	اللہ کی سرشت جس پر خدا نے لوگون کو پیدا کیا،
(۲) لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ،	آدمی کو ہم نے بہترین سانچے پر پیدا کیا،
(۳) اَلَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوَّاكَ فَعَدَلَكَ،	جس نے تجھے پیدا کیا، برابر کیا، پھر ٹھیک کیا،
(۴) خَلَقَ فَهَدٰی،	پیدا کیا پھر راہ دکھائی،
(۵) اِنَّا هَدَیْنَاهُ السَّبِیْلَ،	ہم نے آدمی کو (پیدا کرکے) راہ دکھائی،

وغیرہا، جن مین اکثر بغیر کسی تشریح کے اس مدعا پر دلالت کر رہی ہین، آپنے

(۱) لا ادا یجنی جان علی ولدہ ولا مولود علی والدہ۔	کوئی مجرم اپنے بیٹے پر اپنے گناہ کو ڈال نہین سکتا، اور کوئی بیٹا اپنے باپ کے گناہ مین پکڑا نہیں جاسکتا،
(۲) کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَةِ فَابواہ یھودانہ اوینصرانہ او یمجسانہ۔	ہر بچہ اپنی فطرت پر پیدا ہوتا ہے، پھر اس کے ماں باپ اس کو یہودی، نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہین،

حدیثون سے مسئلہ کو بالکل واضح فردیا ہے پھر الست بربکم کی مشہور عہد الست کی آیت سے تو آپ نے یہان تک دعوی فرمایا ہے، کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ہر بچہ توحید کے عقیدہ کو لے کر پیدا ہوتا ہے، اس سلسلہ مین ان مشہور حدیثون سے جن مین مختلف اعمال کے متعلق فرمایا گیا ہے، کہ ان پر عمل کرنے کے بعد آدمی ایسا ہوجاتا ہے، کہ ابھی ابھی

ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا، سید صاحب کا یہ استنباط کہ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے، کہ اسلام کے نزدیک بچے معصوم اور ہر قسم کے گناہون سے پاک پیدا ہوتے ہین، میرے نزدیک نہ صرف نیا بلکہ نہایت لطیف اور نازک استنباط ہے، کم سے کم میری نظر سے یہ نتیجہ اس کتاب سے پہلے نہیں گذرا، اور بات یہین پر ختم نہین ہوجاتی، صلیبی دین کے اس عقیدہ کے مقابلہ مین کہ اصطباغ (بپتسمہ) پانے سے پہلے جو بچے مرجاتے ہین، وہ گنہ گار مرتے ہین، سید صاحب نے اس حدیث کو خوب موقع پر استعمال فرمایا ہے، جس مین ہے کہ چھوٹی عمر میں مرنے والے بچے اپنے ماں باپ کی مغفرت اور بخشایش کرائین گے، یعنی اسلام صرف یہی نہین کہتا، کہ بچے معصوم اور بے گناہ پیدا ہوتے ہین، بلکہ دوسرون کو بھی گناہ سے پاک کرتے ہین، آپ نے یہ بھی ثابت فرمایا ہے، اور صحیح حدیثون کی روشنی میں دکھایا ہے کہ صرف مسلمانون ہی کے بچے نہین، بلکہ اسلام میں تو نامسلمانون کے بچّون کو بھی جنتی بتایا گیا ہے، جن بعض حدیثون سے توقف معلوم ہوتا ہے، یا یہ کہ ان کا انجام ان کے آیندہ طرز عمل کا تابع ہوگا، ان کا ایسا مطلب کہ بعضون کو جو اس میں کچھ شک ہوا ہے، اس کا بالکلیہ ازالہ ہوجاتا ہے، پھر آیاتِ قرآنی

(۱) لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی،	ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا،
(۲) كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ	ہر شخص اپنے کرتوت کے ہاتھون گرو ہے

وغیرہ کو پیش فرمایا ہے، جن مین صاف اعلان کر دیا گیا ہے، کہ ایک کے گناہ سے نہ دوسرا گنہگار ہوتا ہے، اور نہ سزا پا سکتا ہے، ظاہر ہے کہ عیسائیوں کے دونون غیر فطری عقائد کی تردید کے لئے یہ کافی ہے،

بعض دوسرے فرقون کا عقیدہ

اسی ذیل مین سید صاحب نے ان لوگون کا بھی ذکر کیا ہے، جو اس کے قائل تو نہین ہین کہ عمل کی تصحیح نہیں ہوسکتی یعنی بد نیک، اور نیک بد نہین ہوسکتا، یہ تو نہین کہتے، لیکن اسی کے ساتھ جو کچھ وہ کہتے ہین، اس کا یہی مطلب ہے، کہ تصحیح کی کوشش ہی

فضول ہے، ان مین ایک گروہ جو قنوطی اور بکائی (رونی طبیعت والے) کہلاتے ہین، ان کا خیال ہے کہ
کچھ ہی کرو نیکی کرو یا بدی ظلم کرو یا انصاف خونریزی کرو یا جان بخشی، سب کا حاصل کچھ نہین ہے،
گویا وہی ہندی کی مثل کہ "جو پڑھتن سو بھی مرتن جو نہ پڑھتن سو بھی مرتن" دوسری جماعت جو ان کے
مقابل ہے، وہ کہتی ہے کہ ہر بد کے لئے بھی وہی ہے، جو نیک کے لئے ہے، یعنی سب کا انجام
بخیر ہے، یہ خندون اور ضحاکیون کی جماعت کہلاتی ہے، جب سب ٹھیک ہی ہے تو پھر غم کا ہے کا،
ہنسو، اُچھلو، کودو، ان ہی کو رجائی بھی کہتے ہین، ظاہر ہے کہ ان بے بنیاد نظریون کے تسلیم کر لینے
کے بعد سرے سے اعمال کی تصحیح کا سوال ہی اٹھ جاتا ہے، پھر اسکی تدبیرون پر کیا غور کیا جاسکتا ہے،
بہرحال یہ سارے خیالات وعقائد ایسے ہین، کہ جن کی بنیاد پر کسی نہ کسی طریقہ سے بدون کے
نیک اور بُرون کے اچھے بننے کی راہین قطعی مسدود ہو جاتی ہین، اور وہ ساری ہنگامہ آرائیان جو تربیت
وتعلیم، تہذیب وشائستگی، اخلاق وقانون کے نام سے آج دنیا مین جاری وساری ہین، سعی لاحاصل
بے معنی اور فضول ہو کر رہجاتی ہین،

اسلامی عقیدہ کا اعتدال

سید صاحب نے ان سب کے مقابلہ مین اسلام کا بنیادی اصول لَهَا مَا كَسَبَتْ
وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ کا ذکر فرمایا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ نیک کام کا نیک اور بد کا بد انجام
ہے، لیکن اسی کے ساتھ توبہ، عفو ومغفرت کفارہ، دعا، شفاعت وغیرہ مختلف قوانین کے ذریعہ
سے انسانی فطرت کو امید وبیم خوف ورجا مین رکھ کر، نہ رجائیون اور صلیبیون کے مانند گناہون
پر دلیر بنایا ہے، اور نہ تناسخیون اور بکائیون وقنوطیون کی طرح گنہگارون کو مایوس کر کے بدکرداری
کی زندگی پر اصرار کے لئے مجبور کرتا ہے، سید صاحب نے اس ذیل مین آیت قرآنی،

إِنَّهُ لَا يَيْأَسُ مِن رَّوْحِ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْكَافِرُونَ، — اللہ کی رحمت سے ناامید کافر لوگون کے سوا اور کوئی نہین ہوتا،

سے اس نتیجہ پر خوب پہونچے ہین کہ خدا کی رحمت ومغفرت سے صرف وہی مایوس ہو سکتے ہین، جو
کافر ہون، ورنہ مسلمان، جو اپنی زندگی مذکورہ بالا نظریات کی تحت گذارتا ہے، اس کے مایوس
ہونے کے کیا معنی؟

"اعمال واخلاق کی تصحیح" کے سلسلہ مین ایک اور تدبیر جو اکثر قومون مین مروج ہے، وہ ترک دنیا
بھی ہے، عیسائیت بودھمت، ہندومت مین تو اخلاق کے اعلیٰ نمونے، راہبون بھکشوون جوگیون
ہی کے قالبون مین تلاش کئے جاتے ہین،

اسلام مین رہبانیت نہین ہے

اس ابتدائی طرز عمل کے متعلق اسلام کا جو صحیح مطمح نگاہ ہے، سید صاحب نے
اس کو بھی پھیلا کر بیان کیا ہے، اور واقعہ بھی یہی ہے کہ یہ عملی پیچیدگیون کی سلجھانے کی نہیں، بلکہ ٹال دینے
کی راہ ہے، بلکہ اپنی کمزوریون کے چھپانے کا جیسا کہ سید صاحب نے فرمایا ہے، ایک خطرناک آلہ ہے،
سے رُخ موڑ کر بُرائیان چپکے چپکے جس طرح اپنی جڑین پھیلاتی جاتی ہین، قرآن نے

كَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ — ان مین اکثر فاسق ہوتے ہین،

مین اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے، اور مذہبی ادارون کی ہولناک عیب اخلاقی تاریخین اس آیت
کی تفسیرین ہین،

مگر باوجود سب کچھ لکھنے کے سید صاحب کے قلم نے لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ کا ڈھنڈورا اس
طرح نہین پیٹا ہے، جو اس کے نیچے آخرت سے ٹوٹی ہوئی اپنی ذلیل پست دنیا طلبی کی زندگی کے
گھنونے پن کو چھپانا چاہتے ہیں، اور آخر مین تو آپ نے ان صحیح حدیثون کو پیش فرماتے ہوئے جن
مین جلوت سے زیادہ خلوت کو، صحبت سے زیادہ عزلت کو، ان مواقع پر ترجیح دی گئی ہے، جب
آدمی کو

در پے دنیا دین ہم رفت

کا خطرہ پیدا ہو جائے، اور نہ صرف اسی لئے نہیں کہ اخلاقی کمالات کی تطہیر و تزکیہ، نشو و نما کے مواقع تعلقات کے باقی رکھنے کے کی صورت مین میسر آسکتے ہین، اور ان کی صحت و سقم کے جانچنے کی شکل اس کے سوا اور کچھ نہین ہے، کہ آدمی زندگی کی مختلف بھٹیون مین اپنے کو ڈال کر کامیاب نکلے،

بلکہ سید صاحب نے ایک اور نکتہ کی طرف توجہ دلائی ہے یعنی اسلام کی نظر مین ہر شخص صرف اپنے ہی لئے نہین ہے، بلکہ اپنے ساتھ وہ اپنے خاندان قوم ابنائے جنس، اور ان تمام چیزون کے لئے ہے جنکی وہ مدد کرسکتا ہو، اور اسی لئے ایک مسلمان کا فرض جس طرح خود برائی سے بچنا ہے، اسی طرح دوسرون کو بھی بچانا اس کی زندگی کا اہم مقصود ہونا چاہئے، اور اسی قانون کی تعبیر اسلام مین امر بالمعروف[1] نہی عن المنکر سے کیگئی ہے،

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اصول و شرائط

شخصی آزادی جو یورپ کا ایک جدید عصری مغالطہ ہے، سید صاحب کی خوب نظر پہونچی ہے کہ دراصل بائبل کا وہ مشہور فقرہ جو قاتل قابیل[2] نے اپنے شہید بھائی ہابیل کے حق مین کیا "اپنے بھائی کا رکھوالا ہون"، جیسے بدترین سنگدلانہ فقرہ کو استعمال کیا تھا، سید صاحب کے خیال مین یہی فقرہ یورپ کے اخلاقی بانادے قانون کا کبل اوڑھ کر دنیا مین بہ آمد ہوا ہے،

---

[1] اچھی بات کا حکم دینا، بری بات سے روکنا، [2] یہان ایک قابل ذکر لطیفہ ہے، قابیل کے متعلق بائبل مین ہے، کہ جنگ اور گانے بجانے کے آلات کی موجد اسی کی اولاد ہوئی، مغربی قومون مین ان دونون خصوصیتون کو پاکر بعضون کی یہ رائے ہے کہ عموماً یورپ کے باشندے نسل قابیل سے ہین، یہان بعضون کو خیال ہوا، کہ ہر چند بائبل مین قابیل کی بیوی کا نام درج ہے، لیکن سوال ہوتا ہے کہ آدم کی اولاد اس زمانہ مین جس خاص علاقہ مین آباد تھی، اور ابھی دنیا میں منتشر نہین ہوئی تھی، تو قابیل اس علاقہ کو چھوڑ کر جب دور دراز دشت علاقون میں بھاگ گیا، پھر اس کو وہان اپنا جوڑا انسانون میں سے کیسے مل سکتا تھا، ؟ ایک صاحب کا خواب ہے کہ قابیل واقعی اسی مصیبت مین مبتلا ہوا، اور جب آدمیون مین سے جوڑا حاصل کرنے

سید صاحب نے علاوہ قرآنی آیات کے اس فقرہ کے جواب مین مشہور حدیث

كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته، — تم مین ہر ایک رکھوالا ہے، اور ہر ایک اپنی اس رعیت سے پوچھا جائے گا جسکی نگہبانی اس کے ذمہ تھی،

کو پیش فرمایا ہے، پھر اس قانون (امر بالمعروف ونہی عن المنکر) کے استعمال کے متعلق جو شرائط اسلام نے مقرر فرمائے ہین، ان کی تفصیل کی ہے، مثلاً جو برائیون کو چھپا کر کرتا ہے، جستجو اور ٹوہ لگا کر اسکو دلیر نہ کیا جائے، جو کچھ کہا جائے منھ پیچھے نہ کہا جائے، حتی الوسع تنہائی مین نرمی بہی خواہی کے پیرایہ مین سمجھایا جائے، آخر مین قرآن کی آیت

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ — اللہ عدل اور احسان کا تمھین حکم دیتا ہے

اس کی ایک عالمانہ تفسیر پہ یہ بحث ختم ہوتی ہے، سید صاحب نے عدل کی تعبیر قانون سے فرمائی جو حکومت اور جماعت کے اختیار کی چیز ہے، اور احسان یعنی عفو درگذر چشم پوشی شخصی معاملہ ہے، اس سلسلہ مین ملت موسوی، کے قانونی رنگ، اور ملت عیسوی کے احسانی رنگ کو سامنے رکھکر اسلام کی جامعیت کی ایک حسن کارانہ تصویر آپ کے قلم نے کھینچی ہے، سید صاحب نے اس سلسلہ مین جس بات پر تنبیہ فرمائی ہے، وہ یہ ہے کہ عموماً غیرون کو اسلامی قوانین کے عدلی شان پر جو اعتراض ہے، کاش! اگر اپنی دوسری آنکھ سے جمال جہان آرائے مصطفوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا بھی تماشا

(بقیہ حاشیہ ص ۲۵۶) مین ناکام ہوا، تو جو انسانون سے شکل و صورت میں سب سے زیادہ مشابہ بندر تھے، ان کی ایک مادہ کو اس نے اپنے جوڑے کے لئے انتخاب کیا، اسی سے اسکی اولاد جاری ہوئی، گویا اس نسل کی ددھیال تو آدم کی اولاد مین ہے، لیکن ننھیال بندرون مین، عام انسانون کے بعض عادات و افعال میں امتیاز ڈارون کے نظریہ سے کیا اسکی تائید ہوتی ہے، یاجوج ماجوج کے متعلق شیخ اکبر کا یہی دعوی ہے کہ انکی ددھیال صرف آدم کی اولاد ہے

کر لیتے تو اسلام کا احسانی چہرہ ان کے سامنے بے نقاب ہو جاتا، اور یہ فرق اسلئے رکھا گیا ہے، کہ قانون کی جان تو عدل ہے، لیکن زندگی کی روح وہ محمدی اخلاق (صلی اللہ علی صاحبہا) ہی ہیں جن کی تعبیر قرآن نے احسان سے کی ہے،

اسلام کے اخلاقی نظام کی جامعیت

اسلام اور اسلامی دواخانہ کی اس جامعیت کو دکھانے کے بعد سید صاحب کی نظر اسلام کی ایک اور خصوصیت پر پڑی ہے یعنی ان نقائص اور کوتاہیوں کے سوا جن کی وجہ سے عموماً دنیا کے یہ سارے "اخلاقی نظامات" یکرخے اور ادھورے ہو کر رہ گئے ہیں ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اخلاقی زندگی کے جن حقوق کو ان نظاموں میں جگہ بھی دی گئی ہے ان کے بھی صرف اجمالی پہلوؤں کے پیش کر دینے پر قناعت کی گئی ہے لیکن تفصیل کے ساتھ ان کے تمام علل و اسباب نتائج و عواقب کے احاطہ کرنے کے جانب بہت کم توجہ کی گئی، سید صاحب نے بالکل سچ فرمایا ہے، کہ اس فرق کو ملحوظ نہ رکھا جائے، تو بدویانہ قبائلی پنچایتوں، اور اعلیٰ متمدن حکومتوں میں پھر کوئی فرق باقی نہیں رہتا، اپنے منشاء کو ایک مثال سے سمجھاتے ہیں،

"ہر سلطنت نے چوری کو ایک جرم قرار دیا ہے، اور اس لحاظ سے ایک غیر متمدن سلطنت بھی اعلیٰ سے اعلیٰ مہذب حکومت کی ہم پلہ ہے، لیکن اس جرم کے کلی استیصال کے لئے اسقدر کافی نہیں ہے، بلکہ اس کا استیصال صرف اسی وقت ہو سکتا ہے، جب وہ تمام لوگ مجرم قرار دیئے جائیں، جو اس جرم میں اعانت کرتے ہیں، موقع واردات کا سراغ دیتے ہیں، مال مسروقہ کو بیچتے ہیں، خریدتے ہیں، وغیرہ"،

اب اسی معیار کو سامنے رکھتے ہوئے، فرماتے ہیں،:-

"اسلام کو دوسرے مذاہب پر جو ترجیح و امتیاز ہے، اس کا ایک سبب اسکے احکام کی تفصیل ہمہ گیری اور انضباط ہے یعنی اسلام نے اپنے اصول و احکام کی تفصیل اس وسعت و جامعیت کے ساتھ کی ہے، کہ برائی کا کلی استیصال ہو گیا ہے، اور نیکیوں کے مظاہر عام ہو گئے، اس کے برخلاف دوسرے مذاہب نے ان کلیات کے جزئیات کی نہایت نامکمل اور اجمالی تشریح کی ہے،

ایک مثال

اسلام کا نقطۂ نظر اس باب میں کیا ہے، ایک جزئی مسئلہ سے اُسے سمجھاتے ہیں،

"مثلاً توحید تمام مذاہب کا ام الاصول ہے، لیکن کامل طور پر کسی مذہب نے اس حقیقت اور اس کے مظاہر کی تعیین نہیں کی ہے، اس بنا پر ہر مذہب میں شرک کسی نہ کسی صورت میں شامل ہو گیا، صرف اسلام ایسا مذہب ہے، جس نے شرک کے تمام اسباب و علل عواقب و نتائج کی تحدید کی، اور ان کا کلی استیصال کیا"،

شرک کے متعلق اسلام نے اپنے نقطۂ نظر کی تکمیل کن کن تدبیروں سے کی، اس کے متعلق فرماتے ہیں،:-

"شرک کا ایک متداول طریقہ بت پرستی تھا، اس کے انسداد کا سادہ طریقہ یہ تھا کہ یہ تمام قوم کو توحید کی دعوت دی جاتی، اور عرب کے تمام بت توڑ دیئے جاتے، لیکن اسلام نے صرف اس سادہ طریقہ پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ ان تمام چیزوں کو ناجائز قرار دیا جو ان بتوں کی یاد تازہ کر سکتی تھیں"،

سید صاحب معاف فرمائیں گے، کہ اس کے بعد جو فقرہ غالباً بے ساختہ آپ کے قلم سے نکل گیا ہے، شاید اس وقت "جواز تصویر" کا فتوی پیش نظر نہ رہا، یا واقعی یہ یقین کروں کہ عالم چونکہ ہمیشہ معلوم کا تابع ہوتا ہے، اسلئے جو حکم نہیں دیتے، وہ بغیر کسی جھجک کے اپنے معلومات کی گردش کے ساتھ خود بھی گھوم جاتے ہیں، شرائع و ادیان جو حکم ہیں، ان میں جب نسخ جاری ہوتا ہے تو علم اس کا بدرجہ اولی مستحق ہے،

بہرحال لکھتے ہین،

"تصویر بجائے خود بُری چیز نہ تھی، تاہم وہ بت پرستی کا عام مظہر تھی، اسلئے اسلام نے اس کو ناجائز ٹھرایا"۔

اسی ذیل مین یعنی شرک کے انسدادی ذرائع مین سید صاحب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تاکیدی تنبیہون کو بھی داخل فرمایا ہے، جن مین حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے متعلق مسلمانون کو اغراق و مبالغہ اطرا و غلو سے بہ سختی روکا ہے، کہ ان ہی چیزون سے آگے چل کر بہ تدریج شرک کی راہین کھلتی ہین، اور اسی کی بدولت آدمی کبھی خدا کا بیٹا (جیساکہ صلیبی دین مین ہوا) ٹھرایا گیا اور کبھی خدا ہی آدمی کا بیٹا قرار پایا، (جیساکہ اوتاری نظریہ کا حاصل ہے)

سید صاحب نے ان مثالون کے بعد اسلام کی اس خصوصیت کے متعلق دنیا کو پیغام دیا ہے کہ: اس معیار پر اسلام کے اعتقادی، عباداتی، اخلاقی، الغرض اس کے تمام تعلیمی شعبون کو مکمل پائینگے سچ یہ ہے کہ علماے اسلام خصوصاً خطبا، و مولفین کے لئے سید صاحب نے ایک نئی راہ کھولی ہے فرماتے ہین کہ اسلام نے

"شرک کے ایک ایک ریشہ کو تاب تاب کر اس کی بیخ کنی کی، یہی حال عبادات کا بھی ہے، اس کے ایک ایک رکن اور طریقہ کو اسلام نے پوری تفصیل سے واضح کر دیا، اور یہی روش اس کی اخلاقی تعلیمات کی تھی، اخلاق کے تمام جزئیات کا پوری طرح احاطہ کرکے اپنے پیرودن کو ان سے ہر طرح آگاہ فرما دیا"،

لہ یعنی اسی نے نہین کہ اب تو تصویرون اور وہ بھی مجسماتی تصویرون سے زیادہ سطحی و کاغذی تصویرون کے پردون سے شیطانی سیلابون کے جن طوفانون کی خوبصورت تعبیرون اور مغالطی نصب العینون کی چھاؤن مین امنڈ امنڈ کر انسانیت خصوصاً شبابی توانائیون کے شگفتہ ترین حلقون پر جو مسلسل چوٹین پڑ رہی ہین

اور سید صاحب کا محتاط قلم اپنے اس بیان کو اس فقرہ پر ختم کرتا ہے،

"کوئی بات سوال وجواب کے لئے باقی نہین رکھی"۔

اسلامی نظام اخلاق کے تین بنیادی مقدمات

واقعہ یہ ہے کہ اخلاقی تعلیمات کی حد تک چھ سو صفحات سے زائد کی یہ کتاب دراصل سید صاحب کے اسی دعوی کی تشریح اور مشاہداتی دلیل ہے، لیکن تفصیل سے پہلے، آپ نے اسلام کے تکمیلی پہلوؤن کو ذہن نشین کرانے کے لئے تین اصولی مقدمات کی شکل مین پہلے ان پہلوؤن کی تلخیص فرمائی ہے،

پہلا مقدمہ یہ ہے کہ انسانی اخلاق واعمال کا ہر وہ فرد، یا جزء جو قابل تصور ہوسکتا ہے، یا جس کا تذکرہ دنیا کے کسی مذہبی یا غیر مذہبی نظام مین پایا جاتا ہے، اسلام نے پوری اہمیت کے ساتھ اپنے یہان بھی اسے جگہ دی ہے، دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ بُرے بھلے اخلاق وکردار کا

(بقیہ حاشیہ ص ۲۶۰) اور آدمی کے وقت پر، مال پر صحت وعافیت پر، جو پیہم بے پناہ ضربین لگ رہی ہین، نوخیز جذبات مین قبل از وقت تلاطم پیدا کرکے آیندہ نسلون کی تباہی و بربادی کا جو سامان پیدا ہو رہا ہے ان کو دیکھتے ہوئے تو اسلامی قوانین کا یہ معمولی جزئیہ (عدم جواز تصویر) آج عظیم الشان کلیہ کی صورت اختیار کر رہا ہے، اور نسل انسانی کے اخلاقی و دینی ہی نہیں، بلکہ جسمانی صحت کے ذمہ دارون کو اس پر مجبور کر رہا ہے، کہ تباہیون کے اس آتش فشان دہانہ کے متعلق وہ آخری فیصلہ کرین جس مین دنیا کے لئے نفع کا کوئی ناقابل لحاظ پہلو یون بھی نہیں پایا جاتا تھا، بڑون کے دیکھنے کی ہوس کی تشفی شاید کوئی قیمت رکھتی، اگر تصویر ان صفات کی نمایندگی کر سکتی، جن کے ساتھ برائیان وابستہ ہوتی ہین، ورنہ تصویر آدمی کے جن صفات کو سامنے لاتی ہے، ان سے تو ہر معمولی آدمی کیا شاید کوئی جانور بھی محروم نہیں دو آنکھون دو کانون دو نتھنون سے بتایا جائے کہ آخر کون مفلس ہے، رہا طب یا اور کسی مسئلہ مین تصویر کی جس حد تک ضرورت ہے جہان تک مین خیال کرتا ہون، تصویر کے سب سے پہلے مخالف (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دوررس نگاہ نے اس کی گنجائش تو رکھ چھوڑی ہے، . والتفصیل فی کتب الفقہ ۱۲،

ہر وہ پہلو جو قابل بحث ہو سکتا ہے، اسلام کی دقیقہ سنج نکتہ رس نگاہ کسی سے قطعاً نہین چوکی ہے تیسرا
مقدمہ یہ ہے کہ نرمی و گرمی، بلندی و پستی کے اعتبار سے انسانی اخلاق و اعمال کے جتنے مدارج قائم
کئے جا سکتے ہین، اسلام نے ان کی پوری نگہداشت کی ہے، اور ہر ایک درجہ کے استعمال کا جو صحیح
وقت و مقام ہے اس کو معین کرتے ہین اس نے دو ٹوک آخری فیصلے صادر کئے ہین، گویا کتاب کیفیا
"اخلاقی باب" مین بھی اسلام اسی طرح مکمل ہے جس طرح انسانی زندگی کے دوسرے شعبون مین
اس کا حال ہے،

ہر مقدمہ کے ثبوت مین جو روشن، واضح، ناقابل تردید دلائل و شواہد سید صاحب نے پیش کئے
ہین، اور سچ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جس تبحر، وسعت نظر، نکتہ شناس فطرت سے آپ کو سرفراز فرمایا
ہے، وہی اس کام کو جیسا کہ چاہئے تھا، انجام بھی دے سکتے تھے، ان کو پڑھ کر اب ایک مسلمان
صرف جذبات خوش اعتقادی کے زیر اثر نہین، بلکہ حجت و برہان کے نشہ سے مست ہو کر بے ساختہ

آنچہ خوبان ہمہ دارند تو تنہا داری

کہتا ہوا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آستانہ قدسی جناب پر

سچ تو یہ ہے کہ ترے در پہ کمی کیا ہے مجھے

پڑھکر اس طرح بیٹھ جاتا ہے، کہ بقول مداح النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) محسن کاکوروی اب اسکی
واقعی یہ حالت ہو جاتی ہے،

کنوین جھانکا کرون کنعان کے تو سودا ہی مجھے
طور پر جاؤن تو ناحق کا بھٹکنا ہے مجھے
خبط ہے سر مین خیال دم عیسیٰ ہے مجھے

"باقی"

مسئلہ اصلاح تعلیم

نفسیاتی اصول پر

از مولینا عبد السلام ندوی

فرانس کے مشہور فلسفی ڈاکٹر گستاولی بان کو ہندوستان مین تو اسکی مشہور کتاب تمدن عرب کے ترجمہ
سے شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی، لیکن مصر مین اس کو زیادہ تر حسن قبول ان فلسفیانہ تصنیفات سے حاصل
ہوا، جو علم النفس کے اصول کو پیش نظر رکھکر موجودہ دور کے اہم مسائل مثلاً تعلیم، سیاست، اشتراکیت اور قومیت
وغیرہ پر اس نے لکھین، چنانچہ مصر مین ان تصنیفات کے ترجمے، روح التربیۃ، روح السیاسۃ، روح الاشتراکیۃ
اور سر تطور الامم کے نام سے کئے گئے، اور نہایت مقبول ہوئے، ہندوستان مین اگرچہ ان کتابون کو عام
مقبولیت حاصل نہین ہوئی، تاہم دار المصنفین نے ان تصنیفات کو نہایت وقعت کی نگاہ سے دیکھا، اور
ان مین روح الاجتماع اور سر تطور الامم کے ترجمے شائع کئے، اور روح الاشتراکیۃ کا خلاصہ
متعدد نمبرون مین معارف مین شائع کیا، لیکن ابھی تک لیبان کے فلسفیانہ خیالات کا پورا ذخیرہ
دار المصنفین بھی شائع نہ کر سکا، اسلئے ہم اس مضمون کے ذریعہ سے آج اسکی ایک اہم کتاب روح التربیۃ
کے اہم مضامین کا خلاصہ معارف کے متعدد نمبرون مین شائع کرنا چاہتے ہین، تاکہ اصلاح تعلیم کا مسئلہ
جو ہمارے ماہرین تعلیم کی دلچسپیون کا ایک بڑا مظہر ہے، علم النفس کی روشنی مین سامنے آجائے، اس کے
بعد اگر ان فلسفیانہ خیالات سے دلچسپی ظاہر کی گئی، تو ہم اس کی پوری کتاب کا ترجمہ بھی شائع کر سکین گے،

اس کتاب کا ترجمہ مصر کے مشہور ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے جو جامعہ مصریہ یعنی مصری یونیورسٹی کے پروفیسر ہین عربی زبان مین کرکے رسالہ الہلال کی طرف سے شائع کیا ہے، اور اس ترجمہ کے مقدمہ مین ترجمہ کی غرض وغایت ان الفاظ مین بیان کی ہے:

"تمام مشرقی عرب اس زمانہ مین ترقی کی طرف قدم بڑھا رہا ہے، اور یہ ترقی صرف سیاسی ترقی نہین ہے، بلکہ سیاست کے ساتھ علم وادب، اقتصادیات اور مختلف اجتماعی نظام بھی اس ترقی مین شامل ہین، اور یہ کہنے کی ضرورت نہین ہے کہ ہر ترقی اصلاح تعلیم پر مبنی ہے،

پس اگر مشرقی عرب خاطر خواہ ترقی حاصل کرنا چاہتا ہے، تو اوس کو عمدہ تعلیم کی ضرورت ہے جو ان صحیح قواعد پر مبنی ہو، جو اس کی نفسیت، عادت، مطمح نظر، اور مختلف اطوار زندگی کے لئے موزون ومناسب ہین،

یہ کتاب مشرق مین تعلیم کی تنقید کے لئے نہین لکھی گئی، بلکہ اس مین صرف فرانس کی تعلیم پر نقد وتبصرہ ہے، اس لئے جو شخص اس کتاب کے ذریعہ سے فائدہ اوٹھانا یا فائدہ پہونچانا چاہتا ہے، اوس کا فرض یہ ہو کہ اس کتاب سے ان رایون کا انتخاب کرے، جو مشرقی اور فرانسیسی دونون تعلیم کے عیوب مشترکہ سے تعلق رکھتی ہین، اور مین نے اس کتاب کے ترجمہ مین صرف اسی بات کو پیش نظر رکھا ہے، اور مجھے توقع ہو کہ اس کتاب کے پڑھنے سے دو نتیجے نکلین گے اور وہ دونون کے دونون نہایت قیمتی ہین،

۱- ایک تو ان اہم عیوب کا احساس پیدا ہو جائے گا، جو مصر کی تعلیم کو خصوصاً اور مشرق کی تعلیم کو عموماً خراب کر رہے ہین،

۲- دوسرے ان بنیادی قواعد کا علم حاصل ہو جائے گا، جن کو جدید مصلحین تعلیم نے نظام تعلیم کی تبدیلی کے لئے اختیار کیا ہے،

اگرچہ کتاب مین صرف فرانس کی تعلیم پر بحث کی گئی ہے تاہم اس مین تعلیم من حیث التعلیم

پر بھی اس حیثیت سے بحث کی گئی ہے، کہ وہ افراد کی تکوین نفس اور قومون اور جماعتون کے لئے ایک اعلیٰ تخیل (آئیڈیل) کے پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، ملک، آب وہوا، اور جماعتون کی روش کے تغیرات سے اگرچہ نظام تعلیم مین بھی تغیر ہو جاتا ہے، لیکن یہ تغیر صرف نظام تعلیم کے فروع وجزئیات مین ہوتا ہے، باقی جوہر تعلیم تو وہ ایک ہی رہتا ہے، اور اسکی صورتین اور اس کی غرضین کتنی ہی مختلف ہون، لیکن اس جوہر مین تعدد نہین پیدا ہوتا، اور یہ جوہر صرف یہ ہے کہ "ایک نفس انسانی کا وجود ہے، جس کے سامنے نیچر کا میدان کھلا ہوا ہے، اور اس نفس کا فرض صرف یہ ہے کہ اس نیچر کا بہترین علم حاصل کرے، تاکہ اس مین زندہ رہنے کی استطاعت پیدا ہو"۔

قومون اور جماعتون مین کتنا ہی اختلاف ہو لیکن تعلیم کا یہی جوہر اور یہی مقصد ہے اسلئے اگر یہ صحیح ہے تو ماہرین تعلیم کا فرض یہ ہے کہ علم النفس کا اچھی طرح مطالعہ کرین، اور علم النفس کے جتنے طریقے ہین، ان مین اور ان علوم مین مناسبت پیدا کرین جو ان کے حصہ مین آئے ہین،

اس کتاب کے مصنف کا یہی مقصد ہے، اور اس پر اس نے نہایت خوبی کے ساتھ بحث کی ہے، اور چند نتائج پیدا کئے ہین، جو گو قطعی نہین ہین تاہم نہایت بیش بہا ہین، اور میرا خیال ہے کہ مین نے ترجمہ مین کوتاہی نہین کی ہے، اور مجھے توقع ہے کہ یہ کتاب مغرب کی طرح مشرق مین بھی مفید ہو گی"۔

اور ہم بھی اس کتاب کے اس ترجمے کا خلاصہ اس توقع کے ساتھ معارف مین شائع کرنا چاہتے ہین، کہ یہ کتاب جس طرح مصر مین مفید ثابت ہوئی ہے، اوسی طرح ہندوستان مین بھی مفید ثابت ہو گی،

اصلاح تعلیم کی ضرورت ایک متفقہ چیز ہے

نظام تعلیم مین جو خرابیان پائی جاتی ہین ان کے اسباب اگرچہ

مخفی ہین، تاہم یہ خرابیان نہایت واضح طور پر نمایان ہین، اور بڑے بڑے ماہرین تعلیم نے ان کا درد انگیز اعتراف کیا ہی، چنانچہ پروفیسر ہنری **وقیل** نے مجمع علمی کے ایک جلسہ مین کہا کہ

"مین زمانہ دراز سے یونیورسٹی کا ایک ممبر ہون، اور عنقریب ریٹائرڈ ہو جاؤن گا، لیکن باوجود اس کے مین اپنے عقیدے کا اعلان نہایت واضح طور پر کرتا ہون، اور وہ یہ ہے کہ یونیورسٹی کا موجودہ نظام ہم کو ایک ایسی جہالت کے غار مین ڈھکیل رہا ہے، کہ اوس سے بڑھکر کوئی جہالت نہین،

اسی جلسہ مین کیمبرڈج کے مشہور پروفیسر **ووماس** نے فرمایا، کہ

"ایک زمانہ دراز سے یہ بات ظاہر ہو گئی ہے کہ اگر نظامِ تعلیم مین تبدیلی نہ کی گئی تو وہ اس شہر کے لئے ایک مصیبت ہو جائے گا، اور اس کو انحطاط کے عمیق غار مین ڈھکیل دیگا۔"

اس نظامِ تعلیم کی اصلی خرابی یہ ہے کہ وہ انسان کے دل و دماغ کو بالکل مفلوج کر دیتا ہے، اور اس کے ذریعہ سے ایسے انسان پیدا ہوتے ہین، کہ جب تک سلطنت کی اعانت شاملِ حال نہ ہو اون کی اخلاقی طاقت، ان کی قوتِ ارادی، اور ان کی قدرت کا مطلق اظہار نہین ہوتا، اور غور و فکر کا مادہ بالکل فنا ہو جاتا ہے، موسیو **پاپو** نے اس مسئلہ کے متعلق اپنی رائے کا اظہار ان الفاظ مین کیا ہے:

"فرنچ طلبہ بذاتِ خود غور و فکر کرنا نہین جانتے، کیونکہ عمر بھر ان کی حالت اوس بوری کی سی رہی جس مین خوب خوب خوگیر کی بھرتی گئی، اسلئے وہ غور و فکر سے بے بہرہ رہ گئے، اس کے علاوہ اس طریقہ سے ان مین پڑھنے سے نفرت کا مادہ پیدا ہو گیا ہی، اسلئے ہم ان کو جو تعلیم دیتے ہین، اوس کی طرف وہ کسی قسم کا میلان ظاہر نہین کرتے، اور ان کی حالت اون بچّون کی سی ہو گئی ہے، جن کے ماں باپ نے ان کو ضرورت سے زیادہ کھلا دیا ہے۔"

اس تعلیم کا بدترین نتیجہ یہ ہی کہ طلبہ خارجی زندگی کے مظاہر سے بالکل بے اعتنائی کرنے لگتے ہین،

اور ہمارے طالب علمون کی حالت ان وحشی قومون کے مشابہ ہو جاتی ہے، جو تمدنی بوقلمونیون سے آنکھین بند کر لیتی ہین، اون کے نزدیک اُن چیزون کا گویا وجود ہی نہین، جو امتحان کی کتابون سے باہر ہین، اگر کوئی شخص ان کے سامنے کسی قدیم تاریخی جنگ کا تذکرہ چھیڑ دے تو وہ اس سے بالکل دلچسپی نہین لیتے، کیونکہ وہ ان کے امتحان کے دائرے سے الگ ہے، ان کے سامنے ٹیلیفون کا محکمہ ہوتا ہے، اور لوگ اوس سے فائدہ اٹھاتے ہین، لیکن چونکہ وہ ان کے امتحان کا موضوع نہین اسلئے وہ اس سے دلچسپی کا اظہار نہین کرتے،

معلوماتِ عامہ سے بے پروائی کے ساتھ ایک اور حیرت انگیز بات یہ ہے، کہ طریقۂ امتحان کا ایک نتیجہ نسیان کی صورت مین بھی ظاہر ہوتا ہے، یہ کس قدر تعجب انگیز بات ہے، کہ جو بدبخت طلبہ امتحان سے پہلے ہندسہ کے دلائل کو ازبر یاد کرتے تھے، وہ امتحان کے چند دنون کے بعد حساب کا معمولی مسئلہ بھی نہین حل کر سکتے،

طریقۂ امتحان کی خرابیان اس قدر واضح ہین کہ ان کا واضح کرنا بالکل تحصیل حاصل ہے، موسیو **بلیطان** فرماتے ہین کہ

"تعلیم کا مقصد امتحان کے سوا اور کچھ نہین اور وہ تمام اوصاف علیہ سے معرا ہے، اور صرف قوتِ حافظہ کو ترقی دیتی ہے، اس لئے امتحان مین ہمیشہ وہ لوگ اوّل درجے مین پاس ہوتے ہین، جن کا حافظہ قوی ہوتا ہے، لیکن اسی نسبت سے ان مین ذہانت کی کمی پائی جاتی ہے،

اکاڈمی کے ایک ممبر کا قول ہے کہ

"جو لوگ امتحان پاس کرنے اور ڈگریان لینے کے لئے تعلیم حاصل کرتے ہین، اون کی حالت گھوڑدوڑ کے گھوڑون کی سی ہوتی ہے، جو باہم ایک دوسرے سے آگے بڑھنا

چاہئے ہیں"

اصلاح تعلیم کا مسئلہ امور ذیل پر موقوف ہے:-

۱- کن ذرائع سے معلومات کو عقل و دماغ مین پہونچایا جاسکتا ہے؟

۲- کن ذرائع سے عقل و دماغ مین ان معلومات کو دوام و استحکام حاصل ہوسکتا ہے؟

۳- عقل و دماغ مین جو معلومات قوتِ حافظہ کے ذریعہ سے پہونچتی ہین، وہ کب تک قائم رہتی ہین، کیا قوتِ حافظہ مین انکے قائم رکھنے کی صلاحیت ہی؟

اخیر سوال کا متفقہ جواب جو علما رنے دیا ہے وہ یہ ہی کہ طلبہ جو کچھ رٹ کر یاد کر لیتے ہین، وہ امتحان سے فارغ ہونے کے چند دنون کے بعد بالکل نسیًا منسیًا ہوجاتا ہے، اور جو معلومات عقل و دماغ مین قوتِ حافظہ کے ذریعہ سے پہونچی ہین، وہ بہت جلد فنا ہوجاتی ہین،

ایک ممتحن یعنی موسیو **چولیان** فرماتے ہین:-

"قوتِ حافظہ اگرچہ ایک پسندیدہ قوت ہے، تاہم وہ دوسری فضیلتون کی تابع اور ان کے زیر فرمان ہے، اور وہ فضیلتین یہ ہین، نقد، منطق، اعتدال، اور پسندیدہ روش، قوتِ حدس وسعتِ نظر وغیرہ"

لیکن جب تک مسابقت باہمی یعنی امتحان کا طریقہ قائم رہے گا، صرف قوتِ حافظہ ہی کو سب سے بڑی فضیلت تسلیم کرنا پڑے گا، گو صرف رٹنے اور قوتِ حافظہ پر زور دینے کا نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ طالب علم حقیقی اور عملی زندگی مین بالکل ناکامیاب رہتا ہے، اور یہ کمزوری سرکاری عہدہ دارون مین جو یونیورسٹیون کے فارغ التحصیل طالب العلم ہوتے ہین، صرف سرکاری خدمات کی انجام دہی مین ظاہر نہین ہوتی، بلکہ اس کا دردانگیز اظہار اس روز ہوتا ہے، جب یہ لوگ گھر سے تلاش معاش مین نکلتے ہین،

اس نظام تعلیم کی خرابیون کا خلاصہ نہایت اختصار کے ساتھ اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ تربیت (بمعنی عام) کا لفظ تعلیم اور اخلاقی اور عقلی ملکات کی نشو و نما پر شامل ہے، لیکن ان مین اخلاقی تربیت سے تو ہماری یونیورسٹیون کو سرے سے کوئی غرض ہی نہین، اور ملکاتِ عقلیہ مین وہ صرف قوتِ حافظہ سے سروکار رکھتی ہین، بقیہ ملکاتِ عقلیہ یعنی قوتِ فیصلہ، قوتِ فکریہ اور قوتِ نقد و بحث سے ان کو کوئی تعلق نہین ہوتا، اور امتحانات مین ان کا مطلق لحاظ نہین رکھا جاتا، بلکہ تعلیم صرف یاد کرنے اور رٹنے کا نام ہے،

ایک پروفیسر نے اس طریقہ تعلیم کی مخالفت کو ایک بڑی دلیری کا کام قرار دیا ہے، وہ کہتا ہے، کہ

"مین نے ایک بڑا اہم اقدام کیا ہے، جس کے لئے ایک عظیم الشان جرأت کی ضرورت تھی، کیونکہ مین نے طلبہ کو علم النباتات کی تعلیم اون کی آنکھون کے سامنے تشریح کے ذریعہ سے دی، صرف الفاظ اور اصطلاحات کے لکھوا دینے پر اکتفا نہین کیا"

فرانس مین ہزارون آدمی اس طریقہ تعلیم کی خرابیون کو محسوس کرتے ہین، لیکن ان مین دس آدمی بھی کسی اصلاحی دستور العمل کے مرتب کرنے کی صلاحیت نہین رکھتے، برسون سے اصلاح تعلیم کی فکرین ہورہی ہین، لیکن اس کا نتیجہ صرف یہ ہوا ہے، کہ مختلف اقسام مین علوم کی تقسیمین کردی گئی ہین، لیکن یہ نظامِ جدید قدیم نظامِ تعلیم سے بھی بُرا ثابت ہوا، چنانچہ فرنچ اکاڈمی کا ایک ممبر کہتا ہے، کہ

"چند ہی سال مین درسی نظام تقسیم کی خرابیان ظاہر ہوگئین ہم کو حقیقت واقعیہ کا یقین کرنا چاہئے، الفاظ کا زمانہ گذر گیا، اور لفظی تربیت زندگی کے لئے موزون نہین رہی، ہماری نئی نسل کو جو ڈگریون کی تلاش مین رہتی ہے، لوگون نے جانور بنا دیا ہے، جو دو

مین ایک دوسرے سے آگے نکل جانا چاہتے ہین، اور یہ لوگ جس چیز کو عقلی اور اجتماعی ترقی کہتے ہین، وہ الفاظ کے الٹنے پلٹنے تک محدود ہو کر رہ گئی ہے، اور وطنی قوت ان پرانے اور غیر مفید الفاظ کے ڈھیر مین گم ہو گئی ہے، اور یہ ڈھیر کیا ہی؟ حفظ کرنا، نقل کرنا، اور ایک ہی لفظ کا بار بار رٹنا،

طریقۂ اصلاح تعلیم لیکن چونکہ تعلیم کی خرابیون کے اسباب معلوم نہین کئے گئے، اسلئے اصلاح تعلیم کیلئے جو کوششین کی گئین، وہ سب کی سب ضائع گئین، بلکہ جس قدر اصلاحی تغیرات کئے گئے اون سے تعلیمی نقائص مین اور زیادہ اضافہ ہو گیا، طریقۂ اصلاح مین تعلیمی نقائص کا سب سے زیادہ ذمہ دار نصاب تعلیم کو قرار دیا گیا، حالانکہ وہ اس خطرناک ذمہ داری سے بالکل بری ہے، کیونکہ تعلیمی خرابیون کی اصلی ذمہ داری طریقۂ تعلیم پر عائد ہوتی ہے، اسلئے یہ کوشش کہ بعض نصاب تعلیم مین اضافہ اور بعض مین کمی کیجائے، بعض کتابین نہ پڑھائی جائین، اور بعض پڑھائی جائین ایک بے سود کوشش ہے، بااین ہمہ غلطی سے نصاب تعلیم مین تو سیکڑون تبدیلیان کی جاتی ہین، لیکن طریقۂ تعلیم مین کوئی تغیر نہین کیا جاتا، حالانکہ تبدیلی صرف طریقۂ تعلیم مین کرنی چاہئے، اور نصاب تعلیم کو اپنی اصلی حالت پر چھوڑ دینا چاہئے، کیونکہ یونیورسٹیون کی تعلیم کے جو نتائج بد نکلے ہین، وہ نصاب تعلیم کی پیداوار نہین ہین، فرانس مین جو نصاب تعلیم مقرر کیا گیا ہے، اوسی قسم کا نصاب تعلیم جرمنی مین بھی رائج ہے، لیکن نتیجہ فرانس کی تعلیم سے بالکل مختلف ہے، فرانس مین نصاب تعلیم مین بار بار تغیرات کئے گئے، لیکن اس سے کوئی فائدہ نہین ہوا، لیکن قریب قریب یہی نصاب تعلیم جرمنی مین بھی موجود تھا، اور اس سے نہایت حیرت انگیز نتائج نکلے، اس سے معلوم ہوا، کہ نصاب تعلیم کو کوئی اہمیت حاصل نہین ہے اہمیت جس چیز کو حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اس نصاب تعلیم سے کیونکر کام لیا جائے،

نصاب تعلیم مین زیادہ سے زیادہ جو اصلاح کیجا سکتی ہے، وہ یہ ہی کہ نصاب تعلیم جس قدر

مختصر ہو گا، اوسی قدر مفید ہو گا، طالب علمون کو ہر فن کے صرف چند اصول پڑھانے چاہئین، البتہ نہایت غور وفکر سے پڑھانے چاہئین، غرض اگر اوستاد اچھا ہے، تو کوئی نصاب تعلیم برا نہین اور اگر استاد برا ہے تو کوئی نصاب تعلیم اچھا نہین،

زمانہ قدیم مین چونکہ علمی اصول نہایت کم اور نہایت مختصر تھے، اس لئے ان کے رٹنے سے قوت حافظہ پر کوئی غیر معمولی بار نہین پڑتا تھا، اس لئے پادریون کا یہ طریقہ تعلیم جو صرف قوت حافظہ پر مبنی تھا، اوس زمانے کی حالت کے لئے موزون تھا، لیکن دور جدید مین علم نے بہت زیادہ ترقی کر لی ہے، اس لئے اب اوس طریقہ تعلیم کے بدلنے کی ضرورت ہے، لیکن ہماری یونیورسٹیون نے اب تک اس حقیقت کو نہین سمجھا اور اسی قدیم طریقہ کے موافق قوت حافظہ سے کام لیتی رہین، یہی وجہ ہے کہ نہایت لمبے چوڑے نصاب تعلیم مقرر کئے گئے، اور ہر روز اس مین نئے نئے علوم کا اضافہ ہونے لگا، اور یونیورسٹیون نے غلطی سے سمجھا کہ اس طریقہ سے طالب علمون کے دماغ مین علم کی ایک بڑی مقدار کو ٹھونسا جا سکتا ہے، لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ علم کی اس بڑی مقدار سے طالب العلمون کو سرے سے علم ہی نہین آتا،

لیکن سوال یہ ہو کہ یہ اصلاحی طریقۂ تعلیم کیسا ہونا چاہئے،؟ اور طریقۂ تعلیم کے بدلنے مین کن کن چیزون کا لحاظ رکھنا چاہئے،؟ پہلے سوال کا جواب نفسیاتی اصول کے مطابق نہایت آسان ہے، کیونکہ تربیت کے معنی اس کے سوا اور کچھ نہین، کہ شعوری چیزون کو لاشعوری چیزون کے قالب مین بدل دیا جائے، اور اس کے لئے صرف غیر ارادی حرکات کے پیدا کرنے کی ضرورت ہے، جن کے پیدا کرنے مین قوت حافظہ کو بہت کم دخل ہے، اس سے ثابت ہوا کہ اس اصلاحی طریقۂ تعلیم مین رٹنے اور امتحان دینے کی گنجایش نہین ہے

لے ملا نظام الدین علیہ الرحمۃ نے جو درس نظامیہ کے بانی ہین، جو نصاب تعلیم مقرر کیا تھا، وہ نہایت مختصر تھا انکے بعد لوگون نے اہمین اور بھی بہت سی کتابونکا اضافہ کیا، اور اسی زمانہ سے ہندوستان مین عربی علوم وفنون یا عربی تعلیم کا دور تنزل شروع ہوا،

اور اس لحاظ سے سب سے زیادہ موزون اور قابل تقلید طریقۂ تعلیم امریکہ کا ہے جس کا اساسی اصول یہ ہے کہ
سب سے زیادہ ترقی یافتہ طریقۂ تعلیم وہ ہے جو طالب العلم کو اس کی شخصی قوت سے فائدہ اوٹھانے کا سب
زیادہ موقع دے، اور اس مین استاذ کو مداخلت کا بہت کم حق حاصل ہو، تاکہ طالب العلم مین آہستہ آہستہ
ایجاد کا مادہ پیدا ہو، اور وہ خود اپنے اعمال کی نگرانی کرے، اور اپنے قوی وملکات پر اس کو پورا قابو
حاصل ہو، اسی اصول پر امریکہ مین تمام علوم کی تعلیم دیجاتی ہے، بالخصوص دستی کامون سے شخصی قوت اور
قوت ارادی کو خاص طور پر نشو و نما حاصل ہوتی ہے، مثلاً

۱- فن نجاری کی تعلیم،

۲- کانون مین کام کرنے کی تعلیم،

۳- لڑکیون کو کھانا پکانے اور سینے پرونے کی تعلیم،

اور تمام چیزون سے پیشتر تربیت دینا مقصود ہوتا ہے اس بنا پر اس طریقۂ تعلیم سے جد و جہد کی قابلیت
اور عملی مہارت حاصل ہوتی ہے اور وہ ہر شخص کی شخصیت اور قوت کو الگ الگ اوبھارتا ہے اور ہر شخص
کو ایک ہی قالب مین نہیں ڈھالتا، البتہ یہ تعلیمی خصوصیات ہمارے سبقی طریقۂ تعلیم یعنی الفاظ و اصطلاحات
کے رٹ لینے سے حاصل نہین ہوسکتین، لیکن چونکہ ہر قوم اور ہر ملک کی اخلاقی حالت ایک دوسرے سے
مختلف ہوتی ہے، اس لئے ایک قوم اور ایک ملک کا طریقۂ تعلیم دوسری قوم اور دوسرے ملک
مین باسانی منتقل نہین کیا جاسکتا، بلکہ اس مین قومیت اور جغرافیانہ خصوصیات کا بھی لحاظ رکھنا پڑتا ہے،
اور اسی اصول کے نظرانداز کر دینے سے اصلاح تعلیم کی بہت سی مفید تجویزین بیکار ہوگئین، مثلاً ایک
تجویز یہ پیش کی گئی، کہ انگریزون کے طریقہ کے مطابق ہائی اسکولون کو شہر کے باہر منتقل کر دینا چاہئے تاکہ
ورزشی کھیلون مین طلبہ کو جس خوشگوار ہوا اور فضا کی ضرورت ہے، وہ ان کو باسانی حاصل ہوسکے،
لیکن اعداد و شمار سے معلوم ہوا کہ چند اسکول جو اس اصول کے مطابق شہر کے باہر قائم کئے گئے ان

مین بہت کم طلبہ داخل ہوئے، کیونکہ فرانس کا ہر خاندان نہایت شدت کے ساتھ اپنے بچون کی نگرانی
اور حفاظت کرنے کا حریص ہے؛ اس لئے اس اصلاح پر عمل نہین ہوسکتا، کیونکہ اس کے متعلق تمام خاندانون
کے خیالات کو بجبر نہین بدلا جاسکتا،

ایک تجویز یہ بھی پیش کی گئی کہ طلبہ کو اپنی شخصیت اور استقلال سے فائدہ اوٹھانے کا کسی قدر
موقع دیا جائے، اور یہ ایک نہایت پسندیدہ خواہش ہے، لیکن ہم مدارس کی نگرانی کرنے والون سے کیونکر
یہ خواہش کرسکتے ہین، ؟ کیونکہ بعض طلبہ جو ان کی نگرانی مین تھے، جب اوس طریقہ سے کھیلون مین
زخمی ہوگئے، تو محکمۂ تعلیم نے اُن پر سخت تاوان اور جرمانہ عائد کیا،

ایک تجویز یہ پیش کیجاتی ہے کہ انگریزی طریقۂ تعلیم چونکہ طلبہ کی اخلاقی حالت، شخصیت اور ان کی
قوت ارادی کو بہت زیادہ ترقی دیتا ہے، اسلئے وہ قابل تقلید ہے، اور اس سے ڈسپلن کی پابندی
کا مادہ خاص طور پر پیدا ہوتا ہے، لیکن جس قوم مین خود یہ تمام اخلاقی خصوصیات نہین پائی جاتین اوس
مین یہ طریقۂ تعلیم کیونکر رائج کیا جاسکتا ہے، ؟ فرانس کی اخلاقی حالت یہ ہے کہ کوئی خاندان اس پر راضی
نہین ہوتا، کہ اس کا بچہ مدرسہ سے تنہا واپس آئے، اس کے ساتھ ایک ایسا آدمی ضرور ہونا چاہئے جو
اسٹیشن سے اس کے لئے ٹکٹ لے دے، گاڑی پر چڑھنے مین اس کو مدد دے، سردی سے بچنے کیلئے
اوس کو کمل اوڑھائے، اور موٹر وغیرہ کے تصادم سے اوس کو محفوظ رکھے، اسلئے اگر فرانسیسی طلبہ کو
بھی یہی استقلال اور آزادی دیدی جائے، تو فرانس کے تمام خاندان چیخ اوٹھین، اور اخبارون مین
مخالفانہ مضامین شائع ہونے لگین، مین نے ایک باپ کو مشورہ دیا، کہ وہ اپنے بچے کو چند مہینے کیلئے
جرمنی مین تکمیل تعلیم کیلئے بھیجدے، لیکن اسکی بی بی نے گھبراکر اس کو طلاق لے لینے کی دھمکی دی، اور کہا
کہ ایک محبت کیش باپ کے لئے یہ کیونکر جائز ہے کہ اپنے بچے کو تنہا جرمنی کے سفر کرنے کی اجازت دے
درانحالیکہ اوسکی عمر اٹھارہ سال سے زائد نہین ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ باپ کو اپنی رائے بدل دینی پڑی لیکن

اس معزز لیڈی کا اس مین کوئی قصور نہ تھا، اوس مین موروثی طریقہ پر یا تعلیم کے اثر سے شخصی قابلیت ہی نہین پیدا کی گئی تھی، پھر وہ اوس کو کیونکر حاصل کر سکتی تھی، لیکن انگریزون کو فطرۃً کسی نگران کار کی ضرورت نہین ہے، بلکہ وہ خود اپنی نگرانی کر سکتے ہین، کیونکہ دنیا مین کوئی قوم انگریزون سے زیادہ ڈسپلن قدیم خاندانی رسم ورواج اور مقررہ عادات وخصائل کی پابند نہین ہے، اسلئے انگریز نگرانی سے بے نیاز ہین، کیونکہ ڈسپلن کی پابندی ان کی فطرتِ ثانیہ بن گئی ہے اور تربیت وتعلیم نے اوس کو اور زیادہ قوت دیدی ہے، اسلئے یہ اصلاحی تجویزین گو کتنی ہی اہم اور عظیم الشان ہون، ہم ان کے نظرانداز کرنے پر مجبور ہین، لیکن بہرحال امریکہ یا انگلستان کا وہ طریقہ تعلیم جس سے طلبہ کی شخصیت اور قوتِ ارادی کو نشو ونما حاصل ہوتی ہے، قابلِ تقلید وقابلِ رواج ہے، اور اس سے صرف معمولی درجہ کے عملی انسان ہی نہین پیدا ہو سکتے، بلکہ بڑے بڑے جانباز سپاہی اور بڑے بڑے بہادر جنرل بھی پیدا ہو سکتے ہین، یہی وجہ ہے کہ اس کتاب مین تربیت وتعلیم کے جو بنیادی اصول مذکور ہین فوجی مدارس مین جو خوش قسمتی سے یونیورسٹیون کے اثر سے آزاد ہین، ان کا نہایت گرمجوشی سے خیرمقدم کیا گیا، اور متعدد جنرلون نے سپاہیون کی ایک ممتاز جماعت کو ان کی تعلیم دی، کیونکہ اوس طریقہ تعلیم کا فائدہ جس سے قوتِ فیصلہ، قوتِ فکریہ، قوتِ ارادی اور ضبطِ نفس کی طاقت کو نشو ونما حاصل ہوتی ہے، فوجی کامون مین خاص طور پر ظاہر ہوتا ہے، اس بنا پر یونیورسٹیون کے ارکان جس نکتہ کا تخیل بھی اپنی دماغ مین پیدا نہ کر سکے، سپاہیون اور جنرلون نے اسکو اچھی طرح سمجھ لیا، ایک فوجی کپتان موسیو **جوشیر** نے "فوج اور سپہ سالاری کی نفسیت کی بحث" کے عنوان سے فوج کے سامنے چند لکچر دیئے، اور اون مین تعلیم کے وہ تمام طریقے بیان کئے، جو علم النفس کے جدید نتائج پر مبنی ہین، ایک مضمون نگار نے ایک مضمون مین اس پر نہایت مفید بحث کی ہے، وہ لکھتا ہے کہ

"تربیت کی جو تعریف ڈاکٹر گستا ولی بان نے کی ہے، اب تک اوس کی کوئی

کامل اور دقیق تعریف اس سے بہتر نہین کیجا سکی ہے، اور وہ تعریف یہ ہے کہ تربیت اوس فن کا نام ہے جس سے شعوری چیزون کو غیر شعوری چیزون مین شامل کیا جا سکے، چونکہ فوجی تربیت مین عقیدہ اور عمل کے درمیان اتحاد پیدا کرنے کا یہ بہترین بنیادی اصول ہے، اس لئے انگریز فوجی افسرون نے اسکو قبول کر لیا ہے،

کیونکہ ان افسرون کو یہ معلوم ہے کہ میدان جنگ مین سپاہیون کو عقل عمل پر آمادہ نہین کرتی، بلکہ فطری جذبات آمادۂ عمل کرتے ہین، اس بنا پر پوری کوشش کے ساتھ ایک خاص قسم کی تربیت وتعلیم کے ذریعہ سے ہم کو عقلی چیزون کو فطری جذبات کے قالب مین ڈھال دینا چاہیئے"

انگلستان اور امریکہ کے اس طریقۂ تعلیم کا اثر صرف عام عملی زندگی اور فوجی خدمات ہی مین ظاہر نہین ہوتا، بلکہ تمام کارہاے خیر مین اوس کا اثر نمایان ہوتا ہے، کیونکہ امریکہ مین رفاہ عام کے جو کام انجام دیئے جاتے ہین، وہ جذبات، احساسات اور صوفیانہ تخیلات پر مبنی نہیں ہوتے، بلکہ جمہور کی عملی منفعت پر مبنی ہوتے ہین، اسلئے ہر شخص مکاتب، مدارس اور علمی مراکز کے تاسیس وقیام مین جان و مال کی ہر ممکن امداد سے کام لیتا ہے، لیکن اگر ان کی بنیاد جذبات و احساسات پر ہوتی، تو ہر شخص کو یہ سعادت نصیب نہ ہوتی، کیونکہ ہر شخص پر از جذبات اور صوفی منش نہین ہو سکتا،

مکمل انقلاب کی ضرورت

ان تصریحات سے معلوم ہوا ہوگا، کہ جس طریقۂ تعلیم کی بنیاد صرف قوتِ حافظہ پر قائم ہے، اوس کو بدل کر امریکہ کا طریقہ تعلیم رائج کرنا چاہیئے، جہان تعلیم اپنے انتہائی درجۂ کمال کو پہونچ گئی ہے، اور اوس سے معلوم ہوگا، کہ یہ طریقہ تعلیم ہمارے طریقہ تعلیم سے کس قدر مختلف ہے،

امریکن پروفیسر علم النفس کے اصول کے مطابق اچھی طرح جانتے ہین، کہ طلبہ کی قوتِ فیصلہ

قوت فکریہ اور اخلاقی طاقت کو کیونکر ترقی دی جاسکتی ہے، لیکن اس طریقۂ تعلیم مین کتاب کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہین ہے، بالخصوص کتابون کا ازبر کرلینا تو اس طریقۂ تعلیم مین بالکل غیر ضروری اور غیر مفید ہے، لیکن قدیم طریقۂ تعلیم کو بدل کر جدید امریکن طریقۂ تعلیم کو رائج کرنا کوئی معمولی کام نہین، اس کیلئے بہت سے اشخاص بلکہ پورے ملک کی نفسیاتی حالت مین ایک انقلاب پیدا کرنے کی ضرورت ہے، جس کی ترتیب یہ ہے کہ سب سے پہلے اساتذہ، اس کے بعد طلبہ کے والدین، پھر خود طلبہ کی روح مین ایک عام انقلاب پیدا کیا جائے، بلکہ پورے خاندان کی نفسیاتی حالت بدل دی جائے، اور عام رائے مین عظیم الشان انقلاب پیدا کیا جائے، یہ کام اگرچہ نہایت مشکل ہے تاہم ناممکن نہین ہے، اسلئے اگر عام جد وجہد کی جائے تو اوس مین کامیابی حاصل ہوسکتی ہے،

اساتذہ اس انقلاب و تغیر مین سب سے اہم شخصیت اساتذہ کی ہے، اسلئے اساتذہ کی حالت پر نہایت مفصل بحث کرنے کی ضرورت ہے،

اساتذہ کی حالت مین انقلاب پیدا کرنے کی ایک صورت بعض لوگون نے یہ بتائی ہے کہ اون کو کامل آزادی دیدی جائے، یعنی وہ جو چاہین پڑھائین، اور جس طرح چاہین پڑھائین، کسی کو اون کی اس آزادی مین خلل انداز ہونے کا حق حاصل نہ ہو، اگرچہ اس اصلاحی تجاویز پر عمل کرنا سردست ممکن نہین ہے تاہم اگر وہ عملی صورت اختیار کرے، تو اوس سے دو نہایت اہم نتیجے پیدا ہونگے،

۱- ایک تو یہ کہ بی ٹی، یا ال ٹی[1] کی ڈگری بالکل بیکار ہوجائے گی، اور یہ ایک نہایت مفید نتیجہ ہوگا، کیونکہ کتابون کے حفظ و تکرار کے لحاظ سے سکنڈری تعلیم مین اساتذہ خصوصی (اسپشلسٹ ٹیچر) کی کوئی ضرورت نہین ہے، بلکہ اس کے لئے صرف مربیون کی ضرورت ہے،

اساتذہ مین سب سے بڑا نقص یہ ہو کہ وہ فن تعلیم سے ناواقف ہین، اور طلبہ کو صحیح طور پر پڑھا

---

[1] فرانس مین اس ڈگری کا یہ نام نہیں ہے مین نے مفہوم کو اپنے الفاظ مین ادا کیا ہے،

نہین سکتے، لیکن یہ نقص صرف بی، ٹی یا ال ٹی کی ڈگری سے پیدا ہوا ہے، اسی بنا پر **موسیو لیون پور جو** کہتے ہین کہ

بی ٹی یا ال ٹی کی ڈگری کو اعلی تعلیم کے کسی درجہ مین شامل نہین کرنا چاہئے، بلکہ اس ڈگری کی خصوصیت صرف یہ قرار دی جائے کہ وہ سکنڈری اسکولون مین تعلیم دینے کی استعداد پیدا کردے، **موسیو لیون پور جو** کے علاوہ اور بھی بہت سے ماہرین فن تعلیم کا خیال ہو کہ بہت سے اساتذہ فن تعلیم سے ناواقف ہین، وہ ہر چیز کو تو جانتے ہین لیکن اپنے پیشے کو نہیں جانتے، یا اس پیشے کے عملی جزو کا علم ان کو نہین ہے، طلبہ کے دماغ مین علم کے مسائل کو ٹھونس دینا، اور اشیا کے علل و اسباب کو نہ بتانا کوئی مفید کام نہین ہے، بلکہ ان کو غور و فکر کا طریقہ سکھانا چاہئے، اور صرف قوت حافظہ کی مشق نہین کرانی چاہئے بلکہ اسکے ساتھ عقل کی مشق بھی کرانا چاہئے، ہمارے طلبہ مین جو نقص پایا جاتا ہے، اوس کا سبب یہی ہے،

لیکن درحقیقت اس نقص کے ذمہ دار ہمارے اساتذہ نہین ہین، بلکہ وہ طریقۂ تعلیم ہے جس نے اون سے صرف رٹنے اور حفظ کرنیکی مشق کرائی ہے،

۲- دوسرے یہ کہ اساتذہ کے انتخاب کا متداول طریقہ بدل دینا پڑے گا، اور وہ طریقہ اختیار کرنا پڑے گا، جو جرمنی مین رائج ہے، اور وہ یہ ہے کہ اساتذہ تعلیم کی اجرت خود طلبہ سے لیتے ہین اس لئے طلبہ کی توجہ کو جذب کرنے کے لئے اساتذہ کو غیر معمولی قابلیت کا اظہار کرنا پڑتا ہے، اور اس طرح بہترین اساتذہ مہیا ہوجاتے ہین، اس طریقہ کی وجہ سے خود اساتذہ کے درمیان ایک کشمکش یعنی مقابلہ کی صورت پیدا ہوجاتی ہے، جس کی وجہ سے ان کو اپنے طریقۂ تعلیم مین مفید تغیرات کرنے پڑتے ہین، چونکہ اس طریقہ کے مطابق خود طلبہ کو اساتذہ کے انتخاب کا موقع ملتا ہے، اسلئے ہر علم کے اساتذ

کی جماعت سے وہ اوس استاد کا انتخاب کر لیتے ہین، جو اس علم کی بہترین تعلیم دیتا ہے، اور یہ طریقہ انتخاب خود اساتذہ کو اس بات پر آمادہ کرتا ہے، کہ وہ طلبہ کی طرف توجہ کرنے مین ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرین، کیونکہ ان کو جو مالی فائدہ حاصل ہوتا ہے، وہ طلبہ ہی کے جیب و دامن سے حاصل ہوتا ہے، اسلئے ہر اوستاد اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اوس کے گرد طلبہ کی بہت بڑی جماعت کا اجتماع ہو، اور اسکی مخصوص کتابین عام طور پر شائع ہون، اور یہ بات بغیر غیر معمولی قابلیت اور غیر معمولی شہرت کے حاصل ہی نہین ہو سکتی، لیکن فرانس[1] مین اساتذہ گورنمنٹ کے ملازم ہوتے ہین، اس لئے ان کو اپنی طرف طلبہ کی توجہ کے مبذول کرانے کی ضرورت نہین پڑتی، طلبہ خواہ اون کو پسند کرین یا نہ کرین گورنمنٹ کے خزانہ سے اون کو تنخواہ مل ہی جائے گی، اور گورنمنٹ کے خزانے پر اون کا یہ اعتماد ان کو ہر قسم کی علمی ترقی، ہر قسم کی علمی کشمکش اور ہر قسم کی علمی زندگی کے اختیار کرنے سے باز رکھتا ہے،

اساتذہ مین جو خرابیان پائی جاتی ہین، ان کا ایک عام سبب یہ ہے کہ اکثر اساتذہ ادنی طبقہ سے تعلق رکھتے ہین، اس لئے قدرتی طور پر وہ اعلیٰ درجہ کی تربیت سے محروم رہتے ہین، اور جن مدارس مین وہ تعلیم پاتے ہین، وہ بھی تربیت کے اس نقص کو دور نہین کر سکتے، اس لئے قوم مین ان کی کوئی نمایان حیثیت (پوزیشن) پیدا نہین ہوتی، اور جب اساتذہ کو اپنی پستی کا احساس ہوتا ہے، تو وہ خود قوم سے ناراض ہو کر اپنی خدمت کو نہایت بیدلی سے انجام دیتے ہین، اسلئے اون کی حیثیت [illegible] کی ہوتی ہے، جو گورنمنٹ کے اور محکمون مین کام کرتے ہین، البتہ مذہبی مدارس کے اساتذہ مین یہ نقص نہین پایا جاتا، کیونکہ ان کی ابتدائی تربیت اگرچہ اچھی نہین ہوتی، لیکن مذہبی حیثیت سے اون کو مدرسہ مین جو تربیت حاصل ہوتی ہے، وہ نہایت منظم اور مستحکم ہوتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ادب و احترام کا لحاظ رکھتے ہین، اور مختلف مدارج مین فرق مراتب کرنے سے وہ اعلیٰ سوسائٹی کے لوگون کی سی

---

[1] اور ہندوستان مین بھی،

مجالست و معاشرت کے قابل ہوتے ہین، اور ان مواقع پر اپنی توہین نہین محسوس کرتے، اس لئے سرکاری مدرسون کی ذات سے جو فوائد طلبہ کو نہین حاصل ہوتے، اوس کا ایک سبب تو تعلیم کا نقص اور دوسرا سبب تربیت کا نقص ہے، (ہندوستان مین انگریزی اسکولون کالجون اور یونیورسٹیون کا مقابلہ بھی دینی مدارس کے مدرسون کے ساتھ اس اصول کے مطابق کرنا مفید اخلاقی اور علمی نتائج پیدا کر سکتا ہے)

اس تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا، کہ اصلاح تعلیم کے لئے سب سے زیادہ ضرورت اصلاح اساتذہ کی ہے، ہم فرض کر لیتے ہین، کہ اصلاح تعلیم کی راہ مین جو رکاوٹین تھین، ان کو کسی معجزانہ یا ساحرانہ طاقت نے دفعۃً دور کر دیا، خاندانون کے اوہام و خرافات بالکل زائل ہو گئے، نصاب تعلیم اور طریقۂ درس مین تغیر پیدا ہو گیا، اس حالت مین خیال کیا جا سکتا ہے، کہ اصلاح تعلیم کے لئے جن چیزون مین تبدیلی پیدا کرنے کی ضرورت تھی، وہ سب کی سب بدل گئین، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے، تو در حقیقت کسی چیز مین بھی تغیر نہین پیدا ہوا،

یہ کیون؟ صرف ایک معمولی بات کی وجہ سے اور وہ یہ کہ یونیورسٹیون نے جو اساتذہ تیار کئے ہین، ان کی نفسیت ناقابل تغیر ہے، کیونکہ وہ قدیم اصول کے مطابق تیار ہوئے ہین، اس لئے وہ ان اصول کے سوا اور کسی اصول کو رائج نہین کر سکتے، بلکہ ان کے سوا اور کسی دوسرے اصول کو سمجھ بھی نہین سکتے، کیونکہ وہ ایسے سن اور ایسی عمر کو پہونچ گئے ہین، کہ ان کو کوئی جدید تربیت دی ہی نہین جا سکتی، (دار العلوم ندوہ مین مولانا شبلی نے نصاب تعلیم اور طریقۂ درس مین جو جدید اور مفید تغیر پیدا کرنا چاہا، اوس مین مدرسین ہی کی وجہ سے بڑی دشواریان پیش آئین، اس لئے وہ ہمیشہ بہترین مدرسین کی تلاش مین سرگرم رہے، بلکہ بعض اوقات خود درس دیکر اون کے سامنے درس و تدریس کی بہترین مثال قائم کی) لیکن با این ہمہ ہمیشہ اس اہم مسئلہ سے غفلت اختیار کی گئی، اور یہ خیال کیا گیا کہ جو اساتذہ اتنی بڑی بڑی ڈگریان رکھتے ہین، کیا اون میں بھی کوئی نقص ہوگا،

لیکن درحقیقت یہی مسئلہ جو عام طور پر نظرانداز کر دیا گیا ہے، اصلاحِ تعلیم کے مسئلہ میں سب سے زیادہ قابلِ نقد و بحث ہے، کیونکہ واقعات سے ثابت ہوتا ہے، کہ اساتذہ اپنے طریقۂ تعلیم مین کسی قسم کی تبدیلی نہین پیدا کر سکتے، فرانس کے ایک وزیرِ تعلیم موسیو لیون بورجو نے ذاتی طور پر اصلاحِ تعلیم کی کوشش کی، اور ایک نیا نصابِ تعلیم بنایا، جس مین قدیم زبانون کے بجائے جدید زبانون کی تعلیم کو داخل کیا گیا، اس نصابِ تعلیم مین جو چیزین داخل تھین، ان مین کوئی نقص نہ تھا صرف اساتذہ کی کمی تھی، جو اوس نصابِ تعلیم کے مطابق تعلیم دیتے، لیکن اساتذہ نے اپنے طریقۂ تعلیم مین کوئی تغیر نہین پیدا کیا، اور زندہ زبانون کی تعلیم بھی مردہ زبانون کی طرح دیتے رہے اور علوم کی تعلیم صرف درسی کتابون کے ذریعہ سے دی، اس لئے اس تغیر کا نتیجہ بھی کچھ اچھا نہ نکلا،

ہم نہایت ایمانداری کے ساتھ یہ تسلیم کرتے ہین کہ اساتذہ درسی کتابون پر پورا عبور رکھتے ہین، اور طلبہ کو ہر اوس چیز کی تعلیم دیتے ہین، جو کتابون کے ذریعہ سے دیجا سکتی ہے، لیکن چونکہ اونھون نے تربیت و تعلیم کی جو روش اختیار کی ہے، وہ خود ناقص ہے، اسلئے اس کا نتیجہ اچھا نہین نکلتا، یہی وجہ ہے کہ فرانس مین باہر سے جو ماہرینِ تعلیم آتے ہین، وہ نہایت حیرت کے ساتھ اساتذہ کے اس نقص کو محسوس کرتے ہین، ایک غیرملکی ماہرِ تعلیم نے فرانس کے بعض مدارس کا معائنہ کیا، تو یہ رائے ظاہر کی،

"مین نے صحیح قسم کے بہت سے طلبہ تو دیکھے لیکن اساتذہ اور مربی بہت ہی کم دیکھے"۔

اس سے چالیس سال پیشتر موسیو بریال نے جو کالج دی فرانس کے پروفیسر تھے ان الفاظ مین اساتذہ پر تنقید کی تھی:

سنہ [illegible]ء مین یونیورسٹیون کے اساتذہ کی جماعت قوم کی رایون کی ترجمانی کرتی تھی، لیکن سنہ [illegible]ء مین یہ جماعت اس قدر پیچھے ہٹ گئی، کہ ایک غیرملکی مضمون نگار نے اون کی نسبت

یہ الفاظ لکھے" فرانس مین اساتذہ کا گروہ بالکل بےحس و حرکت ہو کر رہ گیا ہے، حالانکہ اس زمانہ مین جب کہ ترقی کی عام ہوا چل گئی ہے، یہ ناممکن ہو کہ کوئی جماعت اوسی پرانی ڈگر پر چلتی رہے، اساتذہ کا یہ درماندہ گروہ ہر غیرملکی طریقۂ تعلیم کو ٹھکرا دیتا ہے، اور معمولی تغیرات پر آمادۂ بغاوت ہو جاتا ہے،

آخر اساتذہ کی اس ناقابلِ انکار تربیت کے نقص کا اصلی ماخذ کیا ہے؟ صرف وہ ناقص طریقۂ تعلیم جس نے اون کی اس ذہنیت کو پیدا کیا ہے، اونھون نے جو کچھ سیکھا ہے، وہی سیکھاتے ہین اور جس طرح سیکھا ہے اوسی طرح سکھاتے ہین، ان اساتذہ کی جن کو یونیورسٹیون نے پیدا کیا ہے، کیا قدر و قیمت ہے، ؟ اور نوجوانون کی تعلیم و تربیت مین ان سے کیا فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، ؟ ان اساتذہ نے جو طالب العلمون کی بنچ سے اچک کر اوستادی کی کرسی پر متمکن ہو گئے ہین، اپنی زندگی کے پندرہ سال صرف اس دھن مین گذارے ہین، کہ امتحان دین اور اول درجے مین پاس ہو کر تمام طلبہ سے گوے مسابقت لے جائین، ٹریننگ کالجون مین ان کے جو فرائض تھے، وہ روزانہ مشکل اس کے لئے تیار ہو سکتے تھے، تمام کام ایک تباہ کن نظامِ تعلیم کے مطابق انجام پاتے تھے، اور امتحان کی کتابین ان غلامانِ علم کے لیے جنبش و حرکت کا ذرہ برابر بھی موقع نہین دیتی تھین، کتابون کے رٹنے سے اون کے حافظ پر غیرمعمولی بار پڑ گیا تھا، وہ صرف دوسرون کی رائین، دوسرون کے عقائد اور دوسرون کے احکام کو یاد کرتے تھے، خود زندگی اور تجاربِ زندگی کا ان کو کوئی علم نہ تھا کیونکہ ان سے نہ کوئی شخصی کام لیا گیا تھا، نہ اونھون نے کوئی شخصی فیصلہ کیا تھا، اور نہ وہ شخصی ارادہ کے مالک تھے، اس لئے وہ اس پیچیدہ ترین مجموعہ سے جس سے بچے کی نفسیت پیدا ہوتی ہے بالکل ناواقف تھے، ان کو وہ طریقے معلوم نہ تھے، جن کے ذریعہ سے وہ اپنے تلامذہ کی روح سے ربط پیدا کر سکتے تھے، ان کی مثال ایک ناواقف سوار کی تھی، جو ایک سرکش گھوڑے کی پشت پر سوار ہو گیا

تھا، اور وہ ادبھی کو دکرتا تھا، یہ بالکل ممکن ہے، کہ ان اساتذہ کی کرسیون پر ایک فونوگراف رکھدیا جائے اور وہ ان کی خدمات کو انجام دے، (لیکن ہمارے عربی مدارس کے اساتذہ کی حالت اس سے مختلف ہے، قدیم اساتذہ مثلاً ملا نظام الدین، بحرالعلوم، شاہ ولی اللہ، مولینا عبدالحئی مرحوم، اور مولینا لطف اللہ وغیرہ تو طلبہ کو مذہب، اخلاق اور علم مین بالکل اپنا ہم رنگ بنا لیتے تھے، اور اپنی روح کو ان کے اندر پھونک دیتے تھے، جدید عربی اساتذہ بھی بالکل فونوگراف کی حیثیت نہین رکھتے، بلکہ اپنے عقائد واعمال کا کچھ نہ کچھ اثر طلبہ پر ڈال ہی دیتے ہین)

استاد بننے کے لئے اونھون نے چند پیچیدہ سبق پڑھ لئے ہین، اور اپنے تلامذہ کے سامنے اسی پیچیدہ سبق کو دہراتے رہتے ہین،

جرمنی مین جہان یہ ابتر نظام تعلیم یعنی نظام مسابقت وامتحان قائم نہین ہے، اعلیٰ تعلیم کے اساتذہ کی قدر وقیمت کا معیار خود ان کے شخصی اعمال اور ان کی آزاد تعلیم کی کامیابی ہوتی ہے، لیکن فرانس مین جہان امتحان کا سسٹم قائم ہے، وہان چونکہ طلبہ کی تعداد زیادہ اور سرکاری عہدے کم ہوتے ہین، برابر یہ کوشش کی جاتی ہو کہ طلبہ کم تعداد مین پاس کئے جائین، اس بنا پر جو شخص بہت سے الفاظ سب سے زیادہ ازبر کر سکتا ہے، وہی گوے مسابقت لے جاتا ہے، اور اپنے حریفون پر غالب آتا ہے،

(باقی)

خلافت وسلطنت

مولفہ ڈاکٹر امیر حسن صدیقی

یعنی خلافت عباسیہ کے انحطاط کے زمانہ سے لیکر اسکے خاتمہ تک جو جو حکومتیں اس سے وابستہ رہین، خلافت بغداد کے ساتھ، انکے سیاسی ومذہبی تعلقات کی نوعیت اور اسکے نتائج کی تفصیل حجم ۵۰۴ صفحے قیمت غیر مجلد عہر، مجلد عار

"منیجر"

انسانی آزادی جدید سائنس کی روشنی مین

از

جناب پروفیسر معتقد ولی الرحمٰن صاحب ایم، اے،

(۲)

ایڈنگٹن

ایڈنگٹن ان مصنفین مین سے سب سے زیادہ جری ہے، جو طبیعی مظاہر مین منکشف ہونے والے عدم تعین کی بنا پر، اور طبیعیات کی دنیا سے باہر نکل کر نظری نتائج اخذ کرتے ہین، ایڈنگٹن کے مقدمات دو قسمون کے ہین، ایک طرف عدم جبر کے متعلق وہ نتائج ہین، جن پر طبیعی علم پہونچا ہے، ان کے مطابق طبیعی ہستیون کو مجبور اور معین نہین کیا جا سکتا، کیونکہ اصول عدم تعین کی رو سے چھوٹے چھوٹے مظاہر کے کردار وفعل کی پیشین گوئی نہین کیجا سکتی"، مادی دنیا مین علیت کا خاتمہ ہو گیا، جو ضبط پیدا کر دیا گیا ہے، ذہن کے متعلق ہمارے خیالات دوبارہ قائم کئے جا رہے ہین، اور اس وقت یہ کہنا ممکن نہین کہ اونکی آخری شکل کیا ہو گی، لیکن قرائن ایسے ہین کہ علیت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ سمجھنا چاہئے، اس طرح اب ہمین یہ فرض کرنے کی ضرورت نہین کہ ذہن بھی جبری قوانین کے تابع ہے، یا یہ کہ اسکی وجہ سے مادی دنیا مین جبری قانون منسوخ ہو جاتا ہے،" مختصر یہ کہ طبیعی مظاہر کی دنیا مین اب یہ دعوی کرنے کی کوئی وجہ نہین رہی، کہ فطرت بہ لحاظ نوعیت علّی ہے،

لیکن دوسری طرف بعض اہم مقدمات ہین، جو خاص طبیعیات کے میدان سے باہر ہین، ان کا انکشاف اشیا کو جاننے کے طریقون پر غور کرنے سے ہوتا ہے، اگر ہم خارجی اشیا کے علم پر غور

کرتے ہین، تو ایک اہم بات ہمارے سامنے آتی ہے، یعنی یہ کہ ہم ان کو براہ راست نہین، بلکہ علامات کے
ذریعے سے جانتے ہین، مکان، زمان، حرکت، قوت، وغیرہ کا علم بعض آلات پر لکھے ہوئے ہندسون
سے ہوتا ہے، ان اشیا، کی اگر کوئی داخلی ماہیت ہے تو یہ ماہیت کبھی بھی ہمارے علم مین نہین آتی،
اب جن خارجی اشیا، کو ہم اس طریقے سے جانتے ہین، اُن مین سے ایک انسانی دماغ ہے، دماغ کے
متعلق ہمارا تمام علم اس کے حجم اس کی بقا، اسکی حرکات، اسکی حرارت، اس کی توانائی وغیرہ کی پیمایش پر
مشتمل ہوتا ہے، لیکن اس ایک مثال مین یعنی خود اپنے دماغ کے متعلق میرے علم مین وہ علم بھی شامل ہوتا ہی
جو کسی آلے کی سوئی کو دیکھنے سے حاصل نہین ہوتا، اسی علم سے معلوم ہوتا ہی، کہ دماغی کیفیات کے پس پشت
شعور ہوتا ہے، اس طرح اس بحث مین مطالعہ باطن داخل ہو جاتا ہی، جس کے ذریعے سے ہم دماغ کی
داخلی ماہیت تک پہونچ جا سکتے ہین، مختصر یہ کہ ہم اپنے دماغ کی داخلی ماہیت کو ایسے طریقے سے
معلوم کر سکتے ہین جس سے کہ ہم دیگر خارجی اور طبیعی اشیار کی داخلی ماہیت کو معلوم نہین کر سکتے، لہذا
ذرات کے جس مجموعے سے دماغ بنتا ہے، اسکے اس ماہیت کی بدولت جس کو طبیعیات غیر معیّن اور
ناقابل تعیین چھوڑ دیتی ہے، بذات خود ذی فکر شے بننے مین کوئی چیز مانع نہین آسکتی" مطالعہ باطن
ایسی چیزین منکشف کرتا ہی جن کو سائنس منکشف بھی نہین کر سکتی، لیکن جن سے وہ انکار بھی نہین کر سکتی،
انسانی آزادی کے مسئلہ کا روایتی حل یک طرفہ رہا ہے کیونکہ اس مین سائنس کے فیصلون کو تو تسلیم
کر لیا گیا، لیکن مطالعہ باطن کے احکام کو ملحوظ نہین رکھا گیا، جدید زمانے کے حل کا تقاضا ہی، کہ ان معطیات
کو مساوی طور پر اہم سمجھا جائے،

ان مقدمات سے صرف ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے، جب مین اپنے شعور کا معاینہ کرتا ہون تو معلوم
ہوتا ہے کہ ارادہ اسکی جوہری خصوصیت ہی، اب ہم نہایت اطمینان کے ساتھ کہہ سکتے ہین، کہ ارادہ
حقیقی ہی، مادیت کا عقیدہ تھا، کہ جو حرکات ہمارے ارادے کا نتیجہ دکھائی دیتی ہین، وہ در اصل دماغی

حرکات ہین، جو دماغ کے مادی اعمال کے زیر تصرف ہین، ارادہ ایک غیر ضروری ذیلی مظہر ہے جو طبیعی
جسمانی مظاہر کے ساتھ ساتھ پایا جاتا ہے، لیکن یہ عقیدہ فرض کرتا ہی کہ دماغ پر طبیعی قوانین کے اطلاق
کا نتیجہ بالکل معین ہے، ...... اگر طبیعیات کے قوانین پوری طرح عِلّی نہین، تو زائد سے زائد یہ کہا
جا سکتا ہی کہ ذی شعور دماغ کا فعل میکانکی دماغ کے ممکن افعال مین سے ایک ہے، بالکل صحیح
ممکن افعال مین فیصلے ہی کو ارادہ کہتے ہین،...... کسی دماغی مرکز پر بعض ذرات، یا طبیعی دنیا کے بعض عناصر کا
فعل ذہنی فیصلے سے براہ راست معیّن ہوتا ہے، یا یون بھی کہا جا سکتا ہی کہ اس فعل کا سائنٹفک
بیان فیصلے کا ماتحتی پہلو ہے"

بدقسمتی سے اس بیان کا مفہوم بہت کچھ صاف نہین، بظاہر ایڈنگٹن کا مافی الضمیر کچھ ایسے الفاظ
مین بیان کیا جا سکتا ہی کہ اصولِ عدم تعیّن کی رو سے ایک معلومہ حالت مین ایک ذرّے کا وقوع پیشینگوئی
کے قابل نہین، کیونکہ اس سے قبل کی حالت کو صرف اس طرح معلوم کیا جا سکتا ہی کہ ہم کو اس کے
مقام اور شرحِ حرکت کا بھی علم ہو، لیکن یہ ناممکن ہے، اگر کوئی شخص اس واقعہ سے خارجی عدم جبریت
تک پہونچے تو وہ نتیجہ نکال سکتا ہی کہ ایک ذرّے کی کوئی حالت بغیر علت کے یعنی بغیر طبیعی علت کے،
پیدا ہو سکتی ہے، اب فرض کرو کہ زیر بحث ذرہ دماغی ذرہ ہے، لہذا اس ذرے
کی کوئی حالت بغیر طبیعی علت کے پیدا ہو سکتی ہے، یعنی اس کی پیدایش کے لیے اس سے
قبل کسی دماغی حالت کی ضرورت نہین لیکن مطالعۂ باطن شاہد ہے، کہ دماغی ذرے
کی ایک داخلی ماہیت ہوتی ہے، جس کی طبیعیات کے طریقون سے پیمایش نہین
کی جا سکتی، لہذا ہمارا یہ افتراض غیر مباح نہین کہ یہ داخلی ماہیت جس کو ہم ارادہ
کہتے ہین، ذرے کی حالت کو معین کرنے مین عمل کرتا ہے، لہذا طبیعیات کے قوانین
کو توڑے بغیر ایک ذرہ ایک خاص حالت اختیار کر سکتا ہی لیکن بہرصورت یہ ارادے کے احکام کے مطابق عمل کریگا،

اس طرح مادے پر ذہن کا عمل ثابت ہوجاتا ہے، اور اس عمل کے لئے ہم کو کسی طبیعی عمل کی مداخلت کی ضرورت نہیں پڑتی، کیونکہ ذہن طبیعی توجیہ میں نقص کے وقت داخل ہوتا ہے،

اس تمام سے مطلوبہ اختیار کی ضمانت ہوجاتی ہے، ارادہ دماغ پر حاکم ہے، لیکن خود یہ طبیعی اعمال سے متاثر نہیں ہوتا، لہذا یہ تمام مادیون اور مابعد مظہریتون پر فائق ہے، کیونکہ یہ یا تو ذہن کی حقیقت سے انکار کرتی ہیں، یا اس کو دماغی اعمال کا تلچھٹ کہہ دیتی ہیں، لیکن اس سے قانون بقاے توانائی کا اصول نہیں ٹوٹتا، کیونکہ ارادہ طبیعی دنیا میں باہر سے داخل نہیں ہوتا، مختصر یہ کہ سائنٹفک مقدمات اور مطالعہ باطن، دونون، ارادے کی آزادی (اختیار) کے حامی اور وکیل ہیں،

کومپٹن

اس بحث میں کومپٹن ایڈنگٹن کا ہم خیال ہے اگرچہ اوس نے تفاصیل کو، ایڈنگٹن کے مقابلہ مین زیادہ پیچیدہ طریقے سے واضح کیا ہے، کومپٹن کے نزدیک مسئلہ یہ نہین کہ انسانی آزادی کو قوانین قدرت سے کس طرح اخذ کیا جائے، ایسا کرنے سے انسانی آزادی استثنائی بن جاتی ہے؛ حالانکہ یہ بنیادی ہے، بد قسمتی سے زمانہ حال کے کسی فلسفی نے اس واقعہ کی طرف توجہ نہین دلائی کہ اپنے ہاتھ کو ارادۃً حرکت دینے کی ہماری قابلیت نیوٹن کے مسلمہ اور اچھی طرح سے آزمائے ہوئے قوانین کی بہ نسبت زیادہ بلاواسطہ طریقے سے اور یقین کے ساتھ معلوم کیجا سکتی ہے، اور یہ کہ اگر یہ قوانین ہاتھ کو ارادۃً حرکت دینے کی قابلیت کے منکر ہین، تو قابل ترجیح نتیجہ یہ ہے کہ نیوٹن کے قوانین ترمیم طلب ہین، لیکن یہ کرنا ضروری نہین کیونکہ خود طبیعی علم نے واضح کیا ہے کہ فطری مظاہر صحیح قوانین کے تابع نہین ہوتے، دوسرے لفظون مین سائنس کو اپنے مرغوب و محبوب قانون علیت سے دست بردار ہونا پڑیگا، کومپٹن کا اصرار ہے کہ میرے نزدیک زیادہ احتمال اس بات کا ہے کہ قانون بقاے توانائی یا حرکیات الحرارت

Thermo-dynamics

کا دوسرا قانون ناقص ثابت ہوگا، نہ یہ کہ ہمین علیت کی طرف عود کرنا پڑے گا"، لہذا کومپٹن ایسا نظریہ وضع کرنے کی کوشش مین ہے جس کی بنا پر انسانی آزادی اور غیر علّی فطرت دونون کو مستخرج کیا جاسکے گا،

فطری واقعات کی پیشینگوئی نہین کی جاسکتی، اس کا مطلب یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے ذرات کے تعلق سے ابتدائی حالات کے علم کی بنا پر ہم نہین کہہ سکتے کہ آیندہ کیا ہونے والا ہے، کیونکہ ان ہی ابتدائی حالات سے ہم ہمیشہ وہی نتیجہ پیدا نہین کرسکتے"، لہذا جو ذرہ کہ ایک خاص راستہ اختیار کرتا ہے، وہ طبیعیات کے قوانین کے لحاظ سے، اس ذرے سے ناقابل تمیز ہوگا، جو کوئی اور راستہ اختیار کرتا ہے، لہذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ ان دونون ذرات مین کوئی فرق ہے بھی یا نہین، اصول علیت کا مطالبہ ہے کہ دنیا کے صرف وہ پہلو حقیقی ہین، جو کسی طرح اپنے آپ کو مشاہدہ کرنے والے کے سامنے ظاہر کرسکتے ہین، اس سے یہ ظاہر نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ فرق و امتیاز جو طبیعیات کے رو سے ناقابل انکشاف ہے، غیر موجود ہے اور بہ حیثیت طبیعیات کے ماہر کے صرف یہی وہ نتیجہ ہے، جس کو نکالنے کے ہم مجاز معلوم ہوتے ہین،

لیکن یہ نقطۂ نظر اتنا وسیع نہین کہ ہمارے تمام تجربون پر حاوی ہوجائے"، لہذا ہمین اپنے افتراض کو اس طرح وسیع کرنا پڑیگا کہ جہان کوئی طبیعی فرق موجود نہین، وہان یہ فرق معلوم ہوجائین، اس قسم کی توسیع یہ فرض کرلینے سے ہوجاتی ہے کہ طبیعی واقعات کے ایسے خواص ہوتے ہین جن کو طبیعی طریقوں سے دریافت نہین کیا جاسکتا، اس افتراض سے ایک طرف تو اس امکان کی گنجائش نکل آئی ہے، کہ دو طبیعی ذرات مثلاً نیکی اور بدی کے لحاظ سے مختلف ہین، اس فرق کا طبیعی مشاہدہ نہین ہوسکتا، لیکن اس کا یہ مطلب نہین کہ یہ غیر موجود ہے، دوسری طرف اس افتراض کا دعویٰ ہے اگر ہمارے دماغ کا مادہ ایسے حالات میں واقع ہوسکتا ہے، جو طبیعی حیثیت سے گو ناقابل تمیز ہین لیکن بلحاظ احوال شعور قابل تمیز ہین"، لہذا ہوسکتا ہے کہ دو دماغی ذرات طبیعی حیثیت سے بالکل ایک

Principle of operationalism. ۵

ہوں، لیکن پھر بھی بہ لحاظ احوال ذہن مختلف ہوں، دماغی ذرات کے اس غیر طبعی فرق کا علم ہم کو غالباً مطالعہ باطن سے ہوتا ہے، اگرچہ ہمیں یہ علم نہیں کہ غیر دماغی ذرات کے خواص مثلاً "نیکی" یا "بدی" کا علم ہم کو کن راستوں سے ہوتا ہے،

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس چیز کو طبعیات بے اصول حرکت کہتی ہے، وہ مطالعہ باطن کے لئے کسی علت کا معلول اور پیشینگوئی کے قابل ہو، ایک خاص حالت میں ایک معلومہ دماغی ذرے کے فعل کے متعلق طبعیات کوئی پیشین گوئی نہیں کر سکتی، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس ذرہ کے مقام اور اسکی شرح حرکت کی تعیین ناممکن ہو، لیکن مطالعہ باطن کو چونکہ اس ذرے کے متعلق مزید معلومات حاصل ہیں لہذا یہ اس کے فعل کی پیشین بینی کر سکتا ہے، مطالعہ باطن کے مدد سے معلوم کیا جاسکتا ہے، کہ ذرے کی طبعی حالت ایک قسم کے فیصلے کیساتھ متلازم ہے، یا دوسری قسم کے فیصلے کے، لہذا پیشینگوئی کیجا سکتی ہے، کہ اس کا فعل کیا ہوگا، یہاں پہونچ کر طبعیات کو اپنی خامی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، کیونکہ "اگر حقیقی آزادی، اور اس کے ساتھ محرکات کے مکمل علم کو فرض کر لیا جائے تو جاندار ہستی کے افعال کی صحیح پیشینگوئی ہو سکتی ہے، بہ نسبت اوس صورت کے کہ ہم کو اس کی محض طبعی حالتوں کا علم ہو"۔

اس نظری ڈھانچے کو مکمل کرنے کے لئے دو باتوں کی اور ضرورت ہے ان میں سے ایک تو نفس ارادی فعل ہے، دماغی ذرہ ارادے کے زیر تصرف ہونا چاہئے، یہاں جو تصویر کومپٹن کے ذہن نے کھینچی ہے، اس کا ذکر ضروری ہے، اس کے نزدیک ذہن کے جس راستے سے برقیے باہر نکلتے ہیں، اس پر پردہ پڑا ہوا ہے، یہ پردہ "نیک" برقیوں کو آگے بڑھنے دیتا ہے، اور "بد" برقیوں کو داخل ہونے سے روکتا ہے اس طرح ذہن ایک طرف تو "نیک" اور "بد" برقیوں میں تمیز کر سکتا ہے، اور دوسری طرف ان کی حرکات پر قابو رکھتا ہے، ظاہر ہے کہ ایسا انتخاب کرنے والا اور قابو رکھنے والا عمل صرف اس وقت ممکن ہو سکتا ہے جب یہ کسی طبعی قانون کے منافی نہ ہو یہاں ہم کو کچھ اندیشہ نہ ہونا چاہئے، طبعیات صرف احتمال کی

بنا پر پیشین گوئی کر سکتی ہے، یعنی یہ صرف اتنا بتا سکتی ہے، کہ ایک ذرہ کے ممکن افعال میں سے ایک فعل کی بہ نسبت دوسرے فعل کے صادر ہونے کا زیادہ یا کم احتمال ہے، لیکن ایسے حالات میں ارادے کے عمل کی مداخلت طبعیات کی رو سے ناقابل انکشاف ہے، اگر ارادے کے انتخابی اعمال اس طرح منضبط ہو جائیں کہ ایک لمبی مدت کے لئے ذرات کے راستوں کی احتمالی تقسیم رک جائے، تب البتہ ایک ایسا اثر پیدا ہوگا جس کو طبعیات مشاہد کر سکے گی، اور اس طرح مداخلت کو منتج کیا جا سکے گا، لیکن ایک یا چند مثالوں میں فیصلے کے عمل کا وجود ناقابل انکشاف ہی رہے گا، مختصر یہ آزادی کا براہ راست شعور طبعیات کے نتیجوں کے منافی نہیں،

دوسری بات جس کی ضرورت ہے، وہ یہ افتراض ہے کہ عضوی کردار اس قسم کا ہے کہ رائی سے پہاڑ بن سکتا ہے، انسانی جسم میں کوئی عمل ایسا ہونا چاہئے، جیسا کہ بندوق میں گھوڑے کا ہوتا ہے، فطرت میں عدم جبریت کا اطلاق صرف خوردبینی اجسام پر ہوسکتا ہے، لہذا انتخابی عمل کا اطلاق بھی چھوٹے چھوٹے مظاہر پر ہونا چاہئے، لیکن جان دار عضویہ بہ ذات خود ایک بہت طاقتور مکبّر[۵] کا کام دیتا ہے، جس میں ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات سے عمل شروع ہو جاتا ہے، جو ابتدائی واقعات کے مشابہ ہوتے ہیں، اور جو ناقابل تعیین ہوتے ہیں، ہمارے ارادی افعال کے ساتھ جو چھوٹے چھوٹے واقعات ہوتے ہیں، ان کی پیچیدگی کو ملحوظ رکھنے کے بعد نہایت وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ خالص طبعی بنا پر آخری نتیجے میں نسبۃً زیادہ عدم یقین ہوگا"۔

اسی طرح کے کسی نظریے کی مدد سے آزادی کا وجدانی وقوف جائز ثابت کیا جا سکتا ہے اور اس میں اور طبعیات میں مطابقت پیدا کیجا سکتی ہے، طبعی قوانین ان حدود کی نشان دہی کرتے ہیں جن کے اندر فعل ممکن ہوتا ہے، ہوسکتا ہے کہ ان حدود کے اندر بہت بڑا رقبہ ہو جس میں ایک

Amplifier, ۵

شخص کسی طبیعی قانون کو توڑے بغیر اپنی مرضی کے مطابق عمل کرے، یہ تو ہمارا روزمرہ کا تجربہ ہے کہ ہم جو چاہتے ہین کرتے ہین، ہماری مرضی یا دوسرے لفظون مین ہمارا شعور، ایک اور تعیینی عنصر ہے، جو ہمارے افعال کو معین کرنے مین طبیعی قوانین کا تکملہ کرتا ہے"! ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظریہ آزادی کے نظری مطالبون کو پورا کرتا ہے، کیونکہ اول تو ارادہ بہ ذات خود واقعات کے طبیعی خواص سے معین نہین ہوتا، ایک لحاظ سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ واقعات کی ایک غیر طبیعی خاصیت کے زیر تصرف ہوتا ہے، کیونکہ یہ واقعات کی "اچھائی" یا برائی سے متاثر ہوتا ہے لہذا بہ لحاظ علت کے ارادہ طبیعی دنیا کا جواب دہ نہین، یہ دنیا تو آزادی کی دشمن ہے، اصل مین ارادہ ایک ماقبلی ذہنی حالت کا جواب ہوتا ہے، جس مین واقعات کی اخلاقی صفات بھی شامل ہوتی ہین، ہم پہلے دیکھ چکے ہین کہ اس طرح یہ مسئلہ جبریت ذات مین تحویل ہو جاتا ہی، جو آزادی کے ہم معنی ہے، لہذا یہ نظریہ آزادی کا ان معنون مین قائل ہے، کہ اس کے مطابق ارادہ طبیعی اعمال سے الگ ایک چیز ہے لیکن دوسری طرف ارادہ طبیعی اعمال پر اثر کرتا ہے، دماغی ذرات ارادے کے زیر تصرف ہوتے ہین، لیکن اس علّی تاثر سے واقعات کی رو مین رکاوٹ پیدا نہین ہوتی، کیونکہ یہ صرف ان حالات مین پیدا ہوتی ہے جہان طبیعیات علتون کو معلوم نہین کر سکتی، لہذا یہ نظریہ آزادی کا ان معنون مین بھی قائل ہے، کہ اس مین ایسے قوانین کی تدوین کی گنجایش ہے، جو طبیعی حالت کے ماقبلی ارادی حالت پر وظائفی انحصار کو بیان کرتے ہین،

پلانک

جن دو مصنفون پر ہم نے اس وقت تک بحث کی ہے، ان مین اور پلانک مین بڑا فرق یہ ہے کہ موخر الذکر اصول عدم تعیین کی مدد کے بغیر آزادی کو منتج کرتا ہی، اس کا خیال ہی کہ عالم خارجی مین اس اصول کی کوئی اہمیت نہین، اس کے نزدیک قانون علیت کی یہ مکمل تردید بہت قبل از وقت ہے، اس دقت کو ایک اور طریقے سے رفع کرنا کہین زیادہ طبعی ہے یہ طریقہ ایسے ہی ادبہت سے موثر مین

بہ مفید ثابت ہوا ہے، اس مین فرض کیا جاتا ہے، کہ طبیعیات کی حد تک یہ بات بے معنی ہے، کہ جن خطوط سے کسی خط کے نقطہ کا مقام معلوم ہوتا ہے، ان کی اور ایک مادی نقطہ کی شرح رفتار کی یک وقتی قیمتین!! ایک معلومہ زنگ کے ذرے کا راستہ، دریافت کیا جائے، ظاہر ہے کہ قانون علیت پر کوئی الزام نہین رکھا جاسکتا کیونکہ ایک بے معنی سوال کا جواب محال ہے، سارا الزام ان افتراضات کے سر تھوپنا چاہیے، جو اس سوال کو پیدا کرتے ہین، زیر بحث مثال مین سارا قصور طبیعی دنیا کی تصویر کی مفروضہ ساخت کا ہے، لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ قدیم نظام کے بجائے جو نظام بھی منتخب کیا جاتا ہے، اس مین یہ علّی ساخت نمایان ہوتی ہے، اگرچہ ہو سکتا ہی کہ اس نئے نظام کے لئے ہم کو لفظ علّی کے مفہوم مین کوئی ترمیم کرنی پڑے، لہذا میری رائے مین طبیعیات کی صحیح ترقی کے لئے ضروری ہے کہ اس علم کے مفروضات مین نہ صرف عام قانون کے وجود کو، بلکہ اس قانون کی علّی نوعیت کو بھی شمار کیا جائے" اس قسم کے غیر مبہم افتراض کی بنا پر اصول عدم تعیین کی شہادت کی مدد سے آزادی کو ثابت کرنے کی کوئی توقع باقی نہین رہتی، لیکن پلانک نے بالکل یہی کیا ہے، اگرچہ اس نے اس اصول کو ایک حد تک بالواسطہ طریقہ سے استعمال کیا ہے،

پہلے تو اس کا دعویٰ ہے کہ انسانی معاملات مین علّی قانون کا سوال ہی پیدا نہین ہونا چاہئے انسانی ذہانت و عقل کے اعلیٰ ترین اصناف ان اعمال مین علّی قوانین کے تابع ہوتے ہین، جن سے ان کے سب سے بڑے کمالات پیدا ہوتے ہین" ہم کو تسلیم کرنا پڑتا ہے، کہ ہمارے جید ترین ذہنون، مثلاً ارسطو، کانٹ، لیونارڈو، گوئٹے، ڈانٹے، یا شکسپیر مین سے ہر ایک اپنے فکر کی بلند ترین پرواز، یا روح کی عمیق ترین غواصی مین علّی مشیت کے تابع تھا، اور ان مین سے ہر ایک اس قادر الکل قانون کا آلہ کار تھا، جو دنیا پر حکمران ہے،

پلانک کا خیال ہی کہ اس قسم کے بیانات سے جو تعجب ہم کو ہوتا ہے وہ علّی قانون کی صحت و راستگی

اطلاق واستعمال کی قابلیت عمل مین تمیز نہ کر سکنے کا نتیجہ ہے، قانونِ علیت ہر حال مین صحیح ہوتا ہے، کیونکہ وہ بالنوعیت ماورائی[1] ہے، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے، کہ ہم خود معمولی فانی ہستیان ہین، اور یہ کہ ہم کبھی توقع نہین رکھ سکتے، کہ جید ذہن مین علت اور صورتِ حال کے نازک تعامل کو معلوم کر سکین گے...... واقعہ یہ ہے کہ مشاہدہ کرنے والے کی ناواہیت مانع آتی ہے، اسی طرح خوردبین سے کام کرنے والا ماہر طبیعیات نظری مظاہر مین خوردبینی اعمال کی تفتیش کرنے کے ناقابل ہوتا ہے، لیکن پھر بھی اس کا یہ مطلب نہین کہ ان خوردبینی واقعات کی حد تک قانونِ علیت صحیح نہین"۔

لہذا پلانک سوال کرتا ہے کہ ان مثالون مین علی تعلقات کے ذکر کے کیا معنی ہین، جن مین مشاہدہ کی دقتون کی وجہ سے اس قانون کا استعمال محال ہوتا ہے؟ قدری مظاہر[2] کی تمثیل سے ہماری بات روشن ہوتی ہے، اصولِ عدمِ تعین کی رو سے کسی ذرّے کے مقام اور اس کی شرح حرکت کو ضروری صحت کے ساتھ ناپنا ناممکن ہے، اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ اس ذرہ کے فعل کی پیشینگوئی ناممکن ہے کیونکہ یہ پیشینگوئی حالت کے علم پر موقوف ہوتی ہے، اور یہ علم ناقابلِ حصول ہے، اب اگر اس عقیدے کو نظریہ علیت کے ساتھ ملایا جائے، تو علم کی محالیت وجود کی محالیت کی بنیاد بن جاتی ہے، لہذا عالمِ خارجی مین عدمِ تعین، یا عدمِ جبریت ثابت ہوتی ہے، لیکن پلانک یہ قدم نہیں بڑھاتا، اس کی رائے ہے، کہ کسی ذرّے کے مقام اور اس کی شرح حرکت کو دریافت کرنے کے وقت پیمائش کے طریقون کے نقص یعنی مشاہدہ کرنے والے اور مشاہدہ کئے گئے مظاہر کے تعلق کا نتیجہ ہے، یہ اصولِ علیت کی صحت سے پیدا ہونے والی دقت نہین، بلکہ اس اصول کے استعمال نہ کئے جا سکنے سے پیدا ہونے والی دقت ہے، اصولِ عدمِ تعین مین خوبی یہ ہے کہ اس نے ہماری توجہ مشاہدہ کرنے والے اور مشاہدہ

---

۱ Transcendental.

۲ Quantum phenomena

کرنے مین اس کے طریقون کی اہمیت کی طرف منعطف کرائی ہے، یا صاف طور پر یون کہو کہ اس نے اُس عام اصول کو واضح کیا ہے، جس کو علی قانون کے استعمال ہو سکنے کے لئے ملحوظ رکھنا پڑتا ہے، وہ اصول یہ ہے کہ محقق اور اس کی شے کے درمیان جتنا کم فاصلہ ہوتا ہے...... اسی قدر کم تیقین اور صحت علی اور باقاعدہ بحث مین پیدا ہوتی ہے" لاپلیس کا خیال تھا، کہ اگر کوئی برتر عقل اُن واقعات کو، جو کائنات مین رونما ہوتے ہین، باہر کھڑی ہو کر دیکھے، تو اس کو انسان اور فطرت کی دنیا کے تمام حادثات مین پیچیدہ ترین اور خوردبینی علی تعلقات تک نظر آ جائین گے، اسی قسم کے فاصلے کی بنا پر ایک شخص ذاتِ مدرک اور تحقیقات کے موضوع مین مطلوبہ انفصال پیدا کر سکتا ہے، اور ہم پہلے دیکھ ہی چکے ہین، کہ تحقیقات مین علی طریقے کے استعمال کے لئے یہ انفصال لازمی شرط ہے، جس قدر قریب بہ لحاظ زمان ہم حادثات کے ہوتے ہین، اسی قدر دشوار ان کی علی ساخت کا کھوج لگانا ہوتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ سائنس مین ایک مثالی روح یا لاپلیسی عالم الکل ہستی کی طرح کی کسی چیز کو استعمال کرنے کی یہی وجہ ہے، سائنٹفک فکر کے لئے ہمیشہ ایک خاص فاصلے، اور فکر کرنے والی ذات اور اس کے مفکور کے درمیان واضح انفصال کی ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے، اور ایک مثالی روح اس فاصلے کی بہترین ضامن ہے"۔

اب ہم ان خیالات کا انسانی آزادی کے مسئلے پر اطلاق کرنے کیلئے تیار ہین، یہ دکھایا جا چکا ہے کہ انسانی افعال علی قوانین کے تابع ہوتے ہین، لہذا انسانی ہستیون پر واقعہ علیت کے اطلاق سے انکار کی گنجایش نہین، لیکن قانون کی قابلیت اطلاق کے متعلق کیا حکم ہے، یہان ایک حقیقی دشواری پیدا ہوتی ہے، ذہن اور مادہ کی ناقابلِ پیمایش دنیا مین ایک واحد نقطہ ایسا ہے جہان سائنس اور اسلئے تحقیق کا علی طریقہ ناقابلِ استعمال ہے، یہ ناقابلیت علی بنا ہی پر نہین، بلکہ منطقی بنا پر بھی ہے، اور یہ ناقابلیت ہمیشہ باقی رہے گی، یہ نقطہ فردی ذات ہے، یہ علی اور منطقی بنا

کیا ہین؟ عملی بنا و بہت آسانی کے ساتھ معلوم کیا جا سکتا ہے، عملاً ہم اپنے ذاتی کردار مین علی تعلقات کو کبھی بھی دریافت نہین کر سکتے، کیونکہ اگر ہم دریافت کرلین تو مطلب یہ ہوگا، کہ مشاہدہ کرنیوالا ہی تحقیق طلب شے بن جائے گا، اور یہ محال ہے، کیون کوئی آنکھ خود اپنے آپ کو نہین دیکھ سکتی، لیکن چونکہ کوئی شخص بھی آج وہ نہین، جو وہ چند برس قبل تھا، لہذا وہ ایک حد تک خود اپنے تجربات کی علی تحقیق کر سکتا ہے، احتمال اس بات کا ہے، کہ یہ دقت عقل انسانی کے محدود ہونے کا نتیجہ ہے، اگر ہماری فہم اور زیادہ جامع ہو، تو ہم خود اپنی مکمل تحلیل کر سکین گے، لیکن یہ غلط ہے، کیونکہ یہان منطقی مشکلات پیدا ہوتی ہین، قانون علیت کی بنا پر کسی فرد کے افعال کی پیشین گوئی کی محالیت کو علم کے اس نقص کی طرف منسوب کرنا بہت بڑی غلطی ہے، جو عقل کی مناسب زیادتی سے رفع کیا جا سکتا ہے، یہ کوشش شروع ہی سے ناکام رہتی ہے، کیونکہ کسی فرد کے ارادے پر قانون علیت کا اطلاق اور اس طریق سے حاصل کی ہوئی تمام واقفیت، بذات خود ایک محرک ہے، جو ارادے پر عمل کرتا ہے، لہذا جس نتیجے تک ہم پہنچنا چاہتے ہین، وہ برابر تبدیل ہوتا رہتا ہے، "ہم نے اوپر ایک اصول بیان کیا ہے، کہ ہم اپنے ذاتی تجربات کے حادثات کے جس قدر قریب ہوتے ہین، اسی قدر دشوار ان حادثات کی روشنی مین خود اپنا مطالعہ ہوتا ہے، کیونکہ مشاہدہ کرنے والے کے افعال جزءاً تحقیق کا موضوع ہوتے ہین، اور اسلئے علی تعلق کا ثابت کرنا قریب قریب محال ہوتا ہے، کسی فعلیت کے وقت یا اس فعیت کے ماحول مین خود اپنا مطالعہ ممکن ہوتا ہے، یہی وہ مقام ہے جہان ارادے کی آزادی (اختیار) داخل ہوتی ہے، اور کسی حریف کے حقوق کو غصب کئے بغیر اپنا جھنڈا گاڑتی ہے، محض علی بنا پر کسی فرد کے افعال کی پیشینگوئی کی محالیت علم کی کمی پر مبنی نہین، یہ اس سادی سی بات پر مبنی ہے، کہ جس طریقے کے استعمال سے کوئی شے بدل جاتی ہے، وہ اس شے کی تحقیق کے لیے موزون نہین، اگر اسی کا نام آزادی ہے، تو یہ آزادی اُس آزادی سے مختلف ہے، جس کی وکالت ایڈنگٹن

اور کومپٹن نے کی ہے، یہ وہ آزادی نہین، جو کسی ایسے عنصر کی موثریت اور فاعلیت پر مبنی ہے، جسکی طبیعیات تحلیل نہین کر سکتی، اور جو کسی طبیعی عمل کا نتیجہ نہین، نہ یہ وہ آزادی ہے، جو جبریت ذات ہے، یہ وہ آزادی ہے، جو پیشینگوئی کی ناقابلیت کے ہم معنی ہے، ذات آزاد ہے، کیونکہ ایک عالم الکل ہستی کے سوا کوئی اور ہستی ان علی عناصر کو معلوم نہین کر سکتی، جو ایک خاص موقع مین عمل کرتے ہین، لہذا انسان بغیر کسی علت کے عمل نہین کرتا، بلکہ یہ اس علم کے بغیر عمل کرتا ہے کہ اس کو کس طرح عمل کرنا چاہیے، وہ ایک علی قانون کے تابع فرمان ہے، لیکن یہ قانون ماورائی ہے، تجربی نہین لہذا خود اپنی فہم کی سطح پر وہ آزاد ہے، لیکن یہ دعویٰ یہ کہنے کے ہم معنی ہے کہ اس کے افعال کی پیشینگوئی نہین ہو سکتی، کیونکہ آزادی کے کسی حد تک بلاواسطہ شعور سے قطع نظر کیجائے تو آزادی کے لفظ کے صرف یہی معنی باقی رہجاتے ہین،

انسانی آزادی کے مسئلے پر جو رائین اوپر بیان ہوئی ہین، ان کی تنقید مشکل نہین، یہ کام قارئین بطور خود کر سکتے ہین، تمام نظری مسائل کی طرح یہان قوی دلائل ناپید ہین، نظری باتون کا زیادہ تنقیدی سوالات پر منحصر ہونا نظری میدان کے کسی اور حصہ کی بہ نسبت اس حصے مین غالباً زیادہ روشن ہے، ظاہر ہے کہ انسانی آزادی کے مسئلے کا حل صرف اس طرح ممکن ہے، کہ "علت" "قانون" "تعین" وغیرہ قسم کی اصطلاحات کی اور زیادہ مکمل تحلیل کیجائے، یہ اصطلاحات تو تمام علوم مین مشترک ہین، انکے علاوہ "ذات" "ارادہ" "ذہن" وغیرہ اصطلاحات بھی تحلیل طلب ہین، یہ اصطلاحات نفسیاتی علوم کے لئے مخصوص ہین، آیندہ زمانے کے متعلق یہ اطمینان کیا جا سکتا ہے، کہ انسانی آزادی کا مسئلہ اس وقت تک حل نہین ہو سکتا، جب تک کہ ان بنیادی تخیلات کو پہلے صاف نہ کرلیا جائے[1]،

---

[1] یہ مضمون پروفیسر اے کورنی لی اس بنجامن کی کتاب (An A. Cornelius Bontamin) (An introduction to the philosophy of science) سے ماخوذ ہے،

مولینا معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ

۲۵ صفر ۱۲۹۹ھ - ۱۰ محرم ۱۳۵۹ھ

۱۰ محرم الحرام ۱۳۵۹ھ یعنی عاشورہ کے دن علم وعمل، فضل وکمال، مجاہدہ واستقامت اور تقوی وطہارت کی ایک ایسی مسند خالی ہوئی، جو غالبًا عرصہ دراز تک خالی رہے گی "انا للہ وانا الیہ راجعون" اس سے ہماری مراد حضرت مولینا معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کا سانحۂ ارتحال ہے، یہ حادثہ محض مولانا کے اہلِ خاندان یا مسلمانانِ اجمیر ہی کے لئے نہین ہے، بلکہ سارا اسلامی ہند اس سے متأثر اور اپنی کم نصیبی پر نوحہ کنان ہے!

وَمَاكَانَ قَيْسٌ هُلْكُهُ هُلْكُ وَاحِدٍ

وَلٰكِنَّهُ بُنْيَانُ قَوْمٍ تَهَدَّمَا

مولینا ایک نومسلم گھرانے مین پیدا ہوئے تھے، والد ماجد مولینا عبدالرحمٰن صاحب مرحوم بلیا کے رہنے والے نومسلم راجپوت تھے، اور والدہ بھی داخلِ اسلام ہوئی تھین، اور دانا پور (بہار) ان کا گھر تھا، تعلق راجپوتانہ سے اس طرح پیدا ہوا کہ مولینا عبدالرحمٰن صاحب ریاست ٹونک مین سکریٹری کونسل تھے، چار پانچسو روپیہ ماہانہ تنخواہ تھی، اسی علاقہ میں دیولی (راجپوتانہ) مین ۲۵ صفر ۱۲۹۹ھ کو پیدا

---

[1] مولینا کی وفات کے سلسلہ مین احباب نے خطوط اور مضامین مین لکھکر بھیجا تھا، اس مضمون مین وہ تمام معلومات یکجا کر دیئے گئے ہین، ان سب دوستون کی اطلاعات کا شکریہ!

ہوئے، اور باپ کے زیرِ سایہ زندگی کی ابتدائی منزلین طے ہوئین، بچپن ہی سے سعادت وفیروزمندی کے آثار نمایان تھے، چنانچہ دولت وثروت کی گود مین پلنے والے اس نوجوان نے ہمیشہ طالب علمون مین مساوات ہی کی زندگی بسر کی، امیرانہ ٹھاٹھ اور رئیسانہ شان کا کبھی مظاہرہ نہ کیا!

قسمت کی خوبی اور نصیب کی بلندی نے خاتم المحققین حضرت مولینا سید برکات احمد صاحب (بہاری ثم) ٹونکی سے تلمذ کا رشتہ قائم کرایا، اس تعلق سے مولینا کا سلسلۂ تلمذ یہ ہے!

حضرت مولینا معین الدین صاحب اجمیری رحمۃ اللہ علیہ،

حضرت مولینا سید برکات احمد صاحب ٹونکی رحمۃ اللہ علیہ،

حضرت مولینا عبدالحق صاحب خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ،

حضرت مولینا فضل حق صاحب خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مولینا فضل امام صاحب خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مُلّا عبدالواجد صاحب خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ،

حضرت مُلّا اعلم صاحب سندیلی رحمۃ اللہ علیہ،[1]

استاذ الکل حضرت مُلّا نظام الدین صاحب سہالوی رحمۃ اللہ علیہ؛

جملہ معقول ومنقول کی تکمیل مولانا برکات احمد صاحب ہی سے ہوئی، ریاضی حضرت مولینا لطف اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل فرمایا، بائیس سال کی عمر مین، علوم مین ایسا رسوخ ہوگیا کہ جس کی نظیر کم دیکھی گئی ہے، اسی وقت سے درس وتدریس کا سلسلہ جاری ہوگیا، ہندوستان اور

---

[1] معارف:- مشہور یہی ہے کہ ملا اعلم سندیلی ملا نظام الدین سہالوی کے براہ راست شاگرد تھے، مگر میری تحقیق میں یہ صحیح نہین ہے، ملا اعلم، ملا کمال الدین سہالوی کے شاگرد تھے، اور وہ ملا نظام الدین کے "س"

ہندوستان سے باہر بلخ، بخارا، چین، افغانستان اور دوسرے ممالک سے طلبہ جوق در جوق آنا شروع
ہوگئے، اسی زمانہ مین ایک خاص واقعہ نے آپ کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے، واقعہ یہ ہو کہ مولینا عبد الحق
صاحب صاحب تفسیر حقانی کے زیر اہتمام آریون سے ایک مناظرہ ترتیب پایا تھا، آریون کی طرف سے
پنڈت واشنانند جی بحث کر رہے تھے، مسلمانون کی طرف سے بھی بڑے بڑے مناظر گفتگو کر رہے
تھے، تین دن سے سلسلہ جاری تھا، جب مولینا کی باری آئی، تو آپ نے روح، مادہ، پرمیشر کی قدامت
کے سلسلہ مین حدوث و قدم کی طویل بحث کو اس خوبی سے بیان فرمایا کہ صرف سات منٹ
مین پنڈت جی لاجواب ہوگئے، اور موافق و مخالف آپ کے تبحر علمی کے قائل ہوگئے، اسی
قسم کا ایک مکالمہ ہز ہائنس نواب حامد علی خان مرحوم والی رامپور کی تحریک پر مولینا عبد الوہاب
صاحب منطقی بہاری مرحوم سے ایک خالص علمی مسئلہ پر ہوا تھا، جس کا نتیجہ بصورت کتاب شائع ہوچکا ہے،
ڈھائی سال مدرسۂ نعمانیہ لاہور مین صدر مدرس رہنے کے بعد ۲۶ھ مین اجمیر کو شرف سکونت
بخشا، اور ۲۷ھ مین مدرسہ معین الحق قائم کیا، سرکار نظام جب اجمیر تشریف لائے، اور حضرت مولینا
کے درس مین مسلسل چھ وقت شریک ہوئے، تو اس قدر متاثر ہوئے کہ خلعت شاہانہ سے سرفراز
فرمایا، اور مولینا انوار اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک پر مدرسہ معین الحق کو معینیہ عثمانیہ قرار دیکر
ساڑھے بارہ سو روپیہ ماہانہ اس کے لئے جاری فرمادیا، مولینا اس مدرسہ کے صدر مدرس ہوئے،
اور پندرہ سال تک یہان درس دیا، ۴۱ھ مین کارپردازان مدرسہ اور مولینا مین اختلاف ہوا،
چنانچہ انھون نے استعفا دیکر محرم ۴۳ھ مین دار العلوم حنفیہ صوفیہ کے نام سے ایک دوسرا مدرسہ قائم
فرمایا، اور ۱۲ سال تک اس مدرسہ کے طلبہ کو اپنے فیوض علمی و عملی سے سرفراز فرمایا، یہ مدرسہ اب تک
قائم ہے، اور شہر کے غریب مسلمان اسکو چلا رہے ہین، دار العلوم معینیہ عثمانیہ سے علٰحدگی کے باوجود اسکے
ارکین مدرسین، طلبہ اور دیگر متعلقین سے تعلقات خوشگوار رہے، ۵۱ھ مین مدرسہ کے ارکین حضرت

مولینا کو پھر اپنے یہان واپس لائے لیکن سیاسی اختلافات کے نتیجہ کے طور پر ۱۲ مارچ ۱۹۳۶ء کو حکم
سرکار نظام دار العلوم معینیہ عثمانیہ سے آپ الگ ہوگئے، لیکن اس علٰحدگی کے بعد بھی حلقۂ درس پر وہی
آب و تاب کیساتھ قائم رہا،

اس زمانہ درس و تدریس مین دوسرے علمی مشاغل بھی جاری رہے چنانچہ مولینا نے تصانیف
کا ایک معتد بہ ذخیرہ چھوڑا ہے، جس کا اکثر حصہ ابھی طبع نہین ہوسکا ہے، مثلاً ترمذی شریف کا ایک
نا تمام حاشیہ، وجود علم و معلوم، کلی طبعی اور مسئلہ دہر پر مکمل اور جامع تقریرین، حضرت خواجہ غریب نواز
کی محققانہ سوانح عمری وغیرہ، یہ چیزین انشاء اللہ جب اہل علم کے سامنے آئین گی، اس وقت انکو
معلوم ہوگا، کہ اجمیر کے اس بوریا نشین کی نگاہ تحقیق کتنی بلند تھی،

آخری زمانہ مین درگاہ بل کی اصلاح کے متعلق جو فتویٰ مولانا نے مرتب فرمایا تھا، وہ اسقدر
جامع اور موثر تھا، کہ ایک طرف تو ہندوستان اور حرمین کے علماء نے اسکی تائید کی اور دوسری طرف
ممبران اسمبلی نے اس بل کے اُن تمام نقائص کو دور کیا جن کا شریعت اسلام سے تصادم ہوتا تھا،!

یہ تھی مولینا کی علمی زندگی! عملی زندگی کا یہ حال تھا، کہ اجمیر مین صد ہا بدعات کا خاتمہ کیا، اسلامی
نقطۂ نظر سے ملک کی صحیح رہنمائی مین، باوجود، چند در چند مشکلات کے کبھی مطلق کمی نہین فرمائی!

تحریک خلافت مین مذہبی فتویٰ کے جرم مین دو سال کی قید و بند کو اس پامردی اور عالی ہمتی
سے برداشت کیا کہ علی برادران نے قدم چوم لئے! جس زمانہ ابتلا مین مولینا کفایت اللہ صاحب صدر
جمعیۃ العلماء، اور مولینا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ العلماء، قید و نظر بندی کی تکلیفین اٹھا رہے تھے، اس
وقت تحریک کی رہنمائی کے لئے آپ ہر ہفتہ دہلی تشریف لیجاتے، اور جامع مسجد مین نماز جمعہ کے بعد
مسائل حاضرہ پر تقریر فرماتے، جمعیۃ العلماء کے اجلاس امروہہ کی صدارت فرمائی، اور مستقل نائب صدر
رہے، صوبہ راجپوتانہ کی مجلس خلافت کو آپ کی صدارت کا ہمیشہ فخر حاصل رہا، تحریک کشمیر کے نا

مین مجلسِ احرار اسلام کے ڈکٹیٹر رہے، مسلمانون کے سوا برادرانِ وطن بھی آپ کی سیاسی بصیرت کے معترف اور اس سے متاثر تھے،!

ان علمی اور سیاسی مشاغل کے ساتھ ساتھ سلوک اور تزکیۂ باطن کی طرف بھی پوری توجہ تھی، مولینا کے والد حضرت شاہ عبد الرزاق صاحب فرنگی محلی سے بیعت تھے، اور خود مولینا شاہ صاحب کے صاحبزادہ، حضرت مولینا شاہ عبد الوہاب صاحب (والد حضرت مولینا عبد الباری صاحب فرنگی محلی مرحوم) سے بیعت تھے،!

استغنا، رجوع الی اللہ، توکل وغیرہ آپ کی طبیعت ثانیہ بن چکے تھے،! آخری سال تو بڑے ہی صبر و استقامت اور متوکلانہ زندگی کے تھے، فرائض تعلیم و افتاء اور رشد و ہدایت کی ادائگی کے بعد کبھی لوگون مین بلا ضرورت نہ ٹھہرتے، اربابِ دولت، اہلِ دنیا، خصوصًا امرا و حکام سے ہمیشہ بے تعلق رہے، لیکن جب کوئی خدمتِ والا میں حاضر ہوتا، تو اپنے قلب مین مولینا کے اخلاق فاضلہ کا خاص اثر لیکر واپس جاتا،!

عبادت کا یہ حال تھا، کہ فرائض کے سوا، نوافل و مستحبات کے بھی ہمیشہ پابند رہے۔ تا دم واپسین اپنے اوراد و اشغال مین فرق نہ آنے دیا، حق گوئی مین کسی بڑی سے بڑی طاقت سے بھی نہین ڈرے، اسلاف کی سنت کے مطابق قید و بند کی مصیبت سے بھی دو چار ہوئے، لیکن اس کو بھی بہنسی خوشی برداشت کیا، اور ہمیشہ وہی کیا، جو ایک مجاہد اور ربانی عالم کو کرنا چاہیئے،

ذاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت و شیفتگی کا یہ عالم تھا کہ بخاری وغیرہ میں جب یہ حدیث آتی کہ حضور کے مرض وفات کی تکلیف دیکھکر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بے اختیار پکار اُٹھین یا ابتاہُ (اے میرے باپ) سرکارِ دو عالم نے فرمایا، لا کرب علی ابیک بعد الیوم (آج کے دن کے بعد تمھارے باپ پر مصیبت نہین ہے) تو اس جملہ پر حضرت مولنا بیتاب ہو جاتے

آنسو نکل آتے ہچکی نکل جاتی، بسا اوقات غشی طاری ہو جاتی، مدرسہ مین درس دیتے وقت ہر نیز یہ واقعہ پیش آیا ہے،!

طلبہ اور علماء سے بہت محبت فرماتے تھے، ہونہار طالب علم مولینا کا مرکز توجہ بن جاتا تھا، ہر سال موسم بہار مین طلبہ کا ایک تفریحی جلسہ جس کو اجمیر کی اصطلاح مین "گوٹ" کہتے ہین، منعقد ہوتا اس جلسہ مین ہر ملک کے طلبہ کے مروجہ کھیلون کا مظاہرہ ہوتا تھا، مولینا طلبہ کی خاطر اس تفریحی اجتماع مین بھی شرکت فرماتے، بیت بازی ہوتی، اس مین ایک فریق کی طرف مولینا بھی ہوتے، آپ ہی کا فریق اکثر غالب رہتا، اس لئے کہ مولانا کو اردو و فارسی کے ہزارہا اشعار یاد تھے،

یہ واقعہ حیرت کے ساتھ سنا جائے گا، کہ مولانا گو ڈیڑھ سو روپیہ مشاہرہ پاتے تھے لیکن تیس روپیہ ماہوار کے سوا، باقی پوری رقم، طلبہ، سامانِ تعلیم، اور نادر کتب کی فراہمی پر صرف کر دیتے تھے، کتاب کتنی ہی قیمتی ہو، لیکن امکان بھر اسکو ضرور خریدتے، اور خواہ دوگنی، سہ گنی قیمت ادا کرنا پڑتی، مگر بہتر نسخہ خریدتے، قرآن پاک بہتر سے بہتر طباعت کے مہیا فرماتے، کلکتہ کے بہترین کارخانہ مین بھیج کر اعلیٰ قسم کی جلدین بندھواتے تھے،

۵ محرم الحرام سنہ ۵۷ھ کو ایسا بیمار ہوئے کہ آخر وقت تک پاؤن سے معذور رہے، دل و دماغ البتہ صحیح رہے، اور اس حالت مین بھی سلسلۂ درس و تدریس جاری رہا، وفات سے دس یوم پیشتر تک حدیث کے اسباق ہوتے رہے،

زندگی ہی مین عرصۂ دراز سے گور غریبان کو اپنا مسکن بنا لیا تھا، احباب کے اصرار سے وہین ایک مختصر مکان بن گیا تھا جس کی تکمیل دار العلوم کی اس رقم سے ہوئی، جو کمیٹی نے بطور اعترافِ خدمات مولینا کو پیش کی تھی، اسی مکان مین مولینا کا انتقال ہوا، ہزارہا مسلمانون نے جنازہ مین شرکت کی

جنازہ کی چارپائی مین لمبی لمبی بلیان باندھی گئی تھین، بیک وقت پچاسون مسلمان کندھا دیتے تھے، پھر بھی ہجوم اور لوگون کے اشتیاق کی کوئی حد نہ تھی، خواجہ اجمیری کی درگاہ مین مسجد شاہجہانی کے زیرِ سایہ تدفین ہوئی، قبر مین اُتارتے وقت در و دیوار، اور درختون پر انسانون کا ہجوم تھا، پسماندگان مین دو بچے (مولوی عبد الباقی صاحب اور ایک صاحبزادی) اور ایک بیوہ ہین،!

اجمیر کی قیام کی مدت ۴۴ سال اور کل مدتِ حیات ۷۰ سال ہے،!

یہ کیسا عجیب اتفاق ہے کہ ٹھیک عاشورہ محرم مین جب لوگ واقعہ کربلا سے سوگوار تھے اس شہید علم و عمل نے دنیا سے کوچ کیا، اور اجمیر مین اہلِ دل نے دوہرے محرم کا سوگ کیا،

تلخیص و تبصرہ

ہندو مسلمانون کے تمدنی تعلقات عہد مغلیہ مین

(۴)

ایسے ہندو شعراء بکثرت ہین، جنھون نے فارسی مین طبع آزمائی کی اور مسلمان تذکرہ نگارون نے ان کو نظر انداز کر دیا ہے، لیکن اس کو کیا کیجئے گا، کہ ایران کے تذکرہ نگارون نے بھی ہندوستان کے مسلمان فارسی شعراء کو اپنے تذکرون مین جگہ نہین دی ہے، ہندو (۱۵۵۹ء) برہمن (شاہجہانی عہد) کشن چند اخلاص (جہانگیری عہد) بنواری داس ولی (۱۶۶۲ء) اپنے مثنوی مولینا روم کے طرز پر ایک مثنوی لکھنے کی کوشش کی، مَل وارستہ سیالکوٹی (۱۶۶۶ء) جسونت رائے منشی (۱۶۱۲ء) شیو رام حیا (۱۶۳۱ء) ... سکھ رائے شوق (۱۶۵۶ء) آنند گھن (۱۶۹۴ء) (مثنوی کجکلاہ کا مصنف) ٹکا رام بہجت اور اس طرح اور بھی شعراء ہین، جن کا ذکر معراج الخیال مؤلفہ وزیر علی عبرتی اور سفینۂ خوشگو مؤلفہ بندرابن داس مین موجود ہے،

قصص و حکایات مین ہندو ادیبون نے متعدد کتابین لکھین، مثلاً گشیش نامہ مؤلفہ خواجہ راج کرن (۱۶۸۹ء) رنگین بہار مؤلفہ کرپا دیال کھتری (۱۶۴۲ء) (اس مین بہرام اور دو ربّ کی لڑکی کا قصہ ہے) قصۂ نوروز شاہ مؤلفہ ادت چند کائستھ عزیز (۱۶۴۴ء) اس مین الف لیلہ کے طرز پر قصے ہین) ملاحت مقال مؤلفہ دلپت رائے (۱۶۶۳ء) سنہاسن بتیسی کے نام سے مختلف

عہد مین مختلف اہل قلم نے قصے لکھے، مثلاً اکبری عہد مین چتر بھوج کایتھ، جہانگیر کے زمانہ مین بہاری مل کھتری، شاہجہان کے دور مین ابن ہرکرن داس، اورنگ زیب کی حکومت مین کشن داس باسدیو لاہوری اور متاخرین مین چندربن مادھورام نے یہ قصہ لکھا، مادھو داس گجراتی نے منکا ومنوہر کے نام سے ایک حکایت لکھی، ہرمین ساکن حصار نے تحفۃ الحکایت یا ہفت گونہ کے نام سے ایک حکایت لکھی، گنجشک ولال پری رنجیت رائے کی تالیف ہے، روپ نرائن (۱۷۰۹ء) نے شش جہت لکھ کر یہ کمال دکھایا کہ ایک ہی چیز کو چھ طریقے سے پڑھنے سے چھ قصے معلوم ہوتے ہین، بنوالی نے سنسکرت سے بود چندرودایا ناٹکا کا ترجمہ فارسی مین کیا، اور نام گلزار حال یا طلوع قمر معرفت رکھا،

جن ہندؤن کے فارسی مکاتیب مشہور ہین، انکے نام یہ ہین، ہرکرن (جہانگیر) چندر بھان (شاہجہان) سجان رائے (۱۶۹۵ء) رام نرائن (۱۷۶۶ء) بھوپٹ رائے (۱۶۱۶ء) شمبھولال منشی (۱۷۹۴ء) تھوڑی مل تمکین (۱۷۲۶ء) دلپت رائے (۱۷۹۴ء) لچھمی نرائن شفیق (۱۸۰۹ء) رنچھوڑ داس (۱۸۳۲ء) لیکھراج منشی (۱۶۹۸ء) مادھورام وغیرہ،

مسلمانون کی حکومت سے پہلے ہندوون نے تاریخ نویسی اور تذکرہ نگاری کی طرف کم توجہ کی، لیکن مغلون کے زمانہ مین اونھون نے فارسی اور ہندی مین بہت سی تاریخین لکھین، مثلاً لب التواریخ مؤلفہ رائے بندرابن (یہ تاریخ فرشتہ کا خلاصہ ہے) خلاصۃ التواریخ مؤلفہ سجان رائے (۱۶۹۵ء) تاریخ دلکشا بھیم سین (اس مین اورنگ زیب کے دکنی محاربات کا ذکر ہے) چار چمن از چندر بھان، چار گلشن از رائے چترمن، نظام دانش از انند روپ برہمن، عبرت نامہ از کامراج (اس مین اعظم شاہ کے سوانح ہین) تمیق شگرف لچھمی نرائن (دکن کی تاریخ ہے) مآثر آصفی (نظام شاہی خاندان کی تاریخ ہے) بساط الغنائم (مرہٹون کی تاریخ ہے) راجاولی از بنوالی داس، راج سہاولی از منشی ہری رام تاریخ فیض بخش از شیو پرشاد (۱۷۷۶ء)، تاریخ کشمیر از نرائن کول عاجز، کیو گھرنامہ از دونی چند

(گوکھرون کی تاریخ ہے) تذکرۃ الامرا از کیول رام (۱۸۰۱ء) فرہنگ کاروانی از جگت رائے دستور العمل آگاہی از آریامل، شاہجہان نامہ از بھگوان داس، دستور العمل از ٹوڈرمل، فتوحات عالمگیری از ایشر داس، فارسی تاریخ نویسی کے اثر سے سنسکرت اور ہندی مین بھی تاریخی کتابین لکھی گئین،

ہندو موضوعون پر جن اہل قلم نے لکھا ہے، ان کی دو قسمین ہین، ایک تو وہ جنھون نے فارسی زبان مین لکھا، دوسرے وہ جنھون نے ہندی زبان مین اپنے خیالات کا اظہار کیا، پہلی قسم مین حسب ذیل افراد ہین،

فیضی نے مثنوی نل ودمن لکھی، جو مہابھارت کے ایک مشہور قصہ سے ماخوذ ہے، عبد الشکور بزمی (۱۶۱۸ء) اور عاقل خان رازی (۱۶۳۴ء) نے پدماوت کا فارسی مین ترجمہ کیا، شیخ نور محمد (۱۷۴۹ء) اور میر عسکری رازی (۱۶۵۴ء) نے منوہر اور مادھومالتی کے قصہ کو منظوم کیا، محمد مراد (۱۶۸۵ء) نے دستور ہمت (قصہ کامروپ اور کاملتا) لکھی، بیانی نے ہیر ورانجھا (۱۷۰۳ء) لکھا، امانت (۱۳۳۲ء) نے سری کرشنا کے واقعات لکھے، عزت اللہ بنگالی (۱۷۲۲ء) نے "بکاؤلی" لکھی، ان مین جو قصے نثر مین لکھے گئے تھے، ان مین سے بعض کو منظوم بھی کیا گیا، ان کے علاوہ عبد القادر بدایونی نے سنگھاسن بتیسی کا نثر مین ترجمہ کیا، اور خرد افزا (۱۵۷۵ء) نام رکھا، تاج الدین مفتی نے (اکبری عہد) ہتوپدیش کا ترجمہ مفرح القلوب کے نام سے کیا، فیضی نے کتھا سرت ساگر کے اکثر قصون کو فارسی زبان مین لکھا، اسی طرح اور بہت ہندی قصے فارسی زبان مین ہین، مثلاً طوطی نامہ از ابو الفضل اور محمد قادری (ستر ہوین صدی) بہار دانش از شیخ عنایت اللہ (۱۶۵۱ء) عجائب القصص، قصہ ملک محمد او شہر بانو (عہد شاہ عالمی) قصہ چترمن (شاہ کالی کٹ) گلشن حسن، افسانہ منوہر و رتناولی وغیرہ

مسلمان مؤرخون نے ہندوؤن کی سلطنتون مثلاً مرہٹہ سکھ، گورگ، میسور اور گوالیار وغیرہ کے حالات لکھے، ان کی توجہ راج ترنگنی مؤلفہ کلہانہ کی طرف خاص طور پر ہوئی، حیدر ابن حسن (۱۶۱۸ء-۲۰)

اور محمد اعظم (۱۰۳۵ھ) نے اوس کو فارسی مین ترجمہ کیا، ہندوؤن کے بعض خیالات کو بھی فارسی زبان مین منتقل کرنے کی کوشش کی گئی، مثلاً مجنون رفیقی نے رسالۂ نانہ دنیا ز لکھا، محبت کے تغیرات و انقلابات دکھائے، غلام علی آزاد نے غزلان ہند لکھ کر فارسی دان اصحاب کو ہندوؤن کے مسئلہ نائکا بھید سے روشناس کیا، ان کی ایک عربی تصنیف ہندوؤن کے عروض پر ہے،

مسلمانون نے ہندی زبان سے بھی خاطر خواہ دلچسپی لی، ہندی زبان کی ابتدا ہی سے مسلمانون نے اس کی ترقی مین حصہ لیا، ابتدائی عہد کے شعراء مسعود سعد سلمان، امیر خسرو اور داؤد تھے، ہندی زبان کا عروج پندرہوین سے اٹھارہوین صدی عیسوی کے درمیان ہوا، اس مدت مین اس زبان کی طرف مسلمان فرمانرواؤن کا اعتنا اور مسلمان اہل قلم کی دلچسپی بہت زیادہ رہی، بہت سے علماء اور صوفیہ نے مذہبی خیالات کی اشاعت اسی زبان کے ذریعہ سے کی، ہندی ادب کے مورخ تقریباً تمام مغل بادشاہون اور اکثر شہزادون کو ہندی کا شاعر بتاتے ہین، ان تمام باتون کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ہندی زبان مین اچھا خاصہ ادب پیدا ہو گیا، یہ تاریخ کا عجیب و غریب واقعہ ہے کہ مسلمان اجنبی کی حیثیت سے ہندوستان مین آئے، لیکن اونھون نے یہان کی زبان سیکھی، اور یہان کے کلچر کی اسپرٹ کو اپنایا، اور ایسی اور تخیل کتابین لکھین جو علمی حیثیت سے بہت بلند اور مستقل ہین،

ہندی زبان کی دو اہم صنفین ہین (۱) مذہبی تصوف (۲) دنیاوی آرٹ، ان دونون مین مسلمان ہندی شعراء کی حیثیت ممتاز اور نمایان ہے، مذہبی تصوف تین حصون مین منقسم ہے (۱) مثالیہ یا مجازیہ (۲) غیر شخصی یعنی مطلق ربانی اصولون کے لحاظ سے زہد و عبادت (۳) شخصی دیوتا کے لگاؤ سے زہد، اول الذکر خالصۃً مسلمانون کی پیدا وار ہے، مرگاوتی از قطبن، مادھومالتی از منجھن، پدماوت از ملک محمد جائسی، چترا ولی از عثمان، گیان دیپ از شیخ نبی، ہنس جواہر از قاسم شاہ، اندراوتی

از نور محمد، پریم رتن از فاضل شاہ اسی کی مثالین ہین، ان نظمون کی خصوصیت یہ ہے کہ ان مین ہندوؤن اور مسلمانون کے خیالات کا اشتراک ہے، مثلاً پدماوت کا قصہ ہندوستانی ہے، اس کے افراد ہندوستانی ہین، ان کے عادات و اطوار ہندوستانی ہین، قصہ کے مناظر ہندوستانی ہین، اس کے اجزاء شروع سے آخر تک ہندوستانی ہین، لیکن پھر بھی یہ خالص ہندو وضع کی نظم نہین، کیونکہ اسلامی اعتقادات کے ماتحت تالیف ہوئی ہے، جس مین شاعر نے ایک دنیاوی عشقیہ قصہ مین ہندی اسلامی تصوف کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے،

ہندی تصوف کی مذکورۂ بالا دوسری قسم کا آغاز کبیر سے ہوا، اس نے توہم جہالت اور فرقہ وارانہ عناد کے تاریک جنگل کو صاف کرکے ایک ایسا راستہ بنایا جس پر ہندو اور مسلمان دونون چلے، گرونانک اور اکبر اس کی تعلیمات سے خاص طور پر متاثر ہوئے، اس نے اپنے دوہون مین ہندو اسلامی عقائد مین امتزاج پیدا کیا، ان دوہون کو اتنی مقبولیت ہوئی، کہ بہت سے شعراء نے اس کا طرز اور زبان اختیار کی ...... مسلمانون مین جن لوگون نے اس کی تقلید مین دوہے کہے، ان مین بابا فرید، رجب، یاری صاحب اور دریا صاحب خاص طور سے لائق ذکر ہین،

ہندی تصوف کی تیسری قسم مین زیادہ تر کرشن اور رام سے محبت کا اظہار کیا گیا ہے، سورداس اور تلسی نے ان دونون کی ذات سے جس عقیدت کا اظہار کیا ہے، وہ بے مثل ہے، لیکن کرشن کی بھگتی پر مسلمان شعراء نے جو طبع آزمائیان کی ہین وہ بھی قابل قدر ہے، ادبی نقادون کا خیال ہے کہ رسکھان کی نظمین مذہب کے جوش اور محبت کے غلو مین کسی دوسرے شاعر سے کم نہین، بلکہ سلاست اور صفائی کے لحاظ سے سورداس پر فوقیت رکھتی ہین، سورداس کی زبان مین اودھی اور برج بھاشا کی آمیزش سے صفائی قائم نہین رہ سکی ہے، دوسرے جن مسلمان شعراء نے کرشن سے عقیدت ظاہر کی ہے، ان کے نام عالم، قادر، جمال، مبارک، ظاہر یا احمد اور تاج ہین،

آرٹ کے نقطۂ نظر سے ہندی شاعری کے باکمال اساتذہ کیشوداس بہاری لال اور دوسرے تھے لیکن مسلمانون نے بھی ان کی تقلید مین طبع آزمائی کی، میر غلام علی آزاد بلگرامی نے بلگرام کے ان مسلمان ہندی شعرا کا ذکر کیا ہے، جو حسب ذیل ہین (۱) شیخ شاہ محمد فرملی، اکبری عہد مین تھا (۲) سید نظام الدین مادھونایک ہندوستانی موسیقی مین بڑا امتیاز رکھتا تھا (۳) دیوان سید رحمت اللہ حاکم مئو، اور جیبوارا کا حاکم تھا اور مشہور ہندی شاعر چنتامنی کا سرپرست تھا (۴) میر عبدالجلیل بھر دیواکر کا فروغ ان ہی کے باعث ہوا (۵) سید غلام نبی رسلین رنگ درپن اور رس پربودھ کا مصنف تھا (۶) سید برکت اللہ پریمی (۷) میر عبدالواحد ذوقی اور (۸) محمد عارف بلگرامی، ان مین رسلین ہندی شاعری کا بہت ہی ممتاز شاعر گذرا ہے، علی محب خان پریتم کا نام بھی اس کی ظریفانہ نظم کھٹمل بایسا کیوجہ سے مشہور ہے، عشقیہ شاعری مین عبدالرحیم خان خانخانان اپنا ثانی مشکل سے رکھتا ہے،

ہندی موسیقی سے مغل بادشاہون نے بڑی دلچسپی لی، اونھون نے اپنے دربار مین موسیقی کے ماہرین کو جمع کیا، ہندی موسیقی کی کتابین فارسی مین ترجمہ کرائین، بخشو نایک نے شاہجہان کے عہد مین ایک ہزار دھرپد جمع کیا، میرزا روشن ضمیر نے پارسی جاتکا، اور فقیر اللہ نے مان کوتوہل تو مان سنگھ کے ترجمے کئے، عوض محمد کامل خانی نے ہندی راگ کے ٹھاٹھون پر کتاب لکھی، رائے چند احمد آبادی نے "اصول غنا" اور مدھونایک نے ہندی نادوی نود تالیف کی،

مسلمانون نے ہندوؤن کے فلسفہ، ان کے مذہبی عقائد ویقینیات کی طرف قابل تحسین میلان دکھایا، چنانچہ ہندو اور مسلمان اہل قلم نے ان کو روشناس کرنے کی کوشش کی، بدایونی، فیضی، ابراہیم سرہندی نے ایک نومسلم پنڈت شیخ بہاون کی مدد سے اتھروید کا ترجمہ کیا، اسی طرح بدایونی، نقیب خان، ملا شیری، سلطان حاجی تھانیسری اور فیض نے مہابھارت کو فارسی جامہ پہنایا،

ہندوؤن کی اور مذہبی کتابین جو فارسی مین ترجمہ ہوئین، وہ حسب ذیل ہین، ہری ونش مترجمہ طاہر محمد اور ملا شیری، بھگوت گیتا مترجمہ فیضی، رامائن مترجمہ بدایونی، جہانگیر کے عہد مین شیخ سعد اللہ مسیح نے اس کو منظوم کیا، اپنشد مترجمہ داراشکوہ، گیان مالا جس مین کرشن اور ارجن کی گفتگو ہے، کرم وسی یا کاوبھرت اور بھری گو کی گفتگو) مہادیو اور پاربتی، سوبھودھنی مترجمہ عبدالرحمن چشتی، مہیش مہانند مترجمہ ابوالفضل، یوگ وسیشٹ تھا الموسوم بہ شارق المعرفت مترجمہ فیضی، اس کتاب کو دارا نے منہاج الحقائق اور شیخ صوفی تھیہانی نے کشف الکنوز کے نام سے ترجمہ کیا، بھگوت کو طاہر محمد اور امانت رائے نے بھی فارسی زبان مین منتقل کیا، وشنو پران شیو پران، برہما دیوت پران، گنیش پران، شاکل پران اور اسی طرح پران کے مختلف حصون مثلاً کاشی کھنڈ، چھتر مہاتمایا، امرت کھنڈ وغیرہ وغیرہ کو مختلف اہل قلم نے فارسی مین ترجمہ کیا،

یوگ پر مختلف کتابین لکھی گئین، نجم الدین حسن نے رسالۂ شکاریہ مین ہندوؤن کے مراقبہ کے طریقے لکھے ہین، ریاحین البساتین مین نروان پر بحث ہے، داراشکوہ کی مجمع البحرین مین یوگ اور تصوف مین امتزاج پیدا کیا گیا ہے، علی شاہ محرابی نے حجۃ الہند مین ہندو مذہب کے خلاف مناظرہ کیا ہے، عبدالرحمن چشتی نے مرأۃ مخلوقات مین یہ دکھایا ہے کہ ہندوؤن کی بعض خرافاتی ہستیان مسلمانون کے تخیل کے مطابق ہین، مثلاً مہادیو کو شاہ جن کہا جا سکتا ہے، اسی طرح حضرت آدم اور حضرت محمد (صلعم) کی شخصیتون سے تطابق دیا ہے،

وحدۃ الوجود کے مسئلہ مین مسلمانون نے بہت سے دلائل فلسفہ ویدانت سے اخذ کئے، شیخ محب اللہ الہ آبادی نے رسالۂ تسویہ مین خالق اور مخلوق کی وحدت دکھانے کی کوشش کی ہے، ان کے شاگرد محسن فانی نے پانچ مذاہب اور ان کے فرقون کا مطالعہ کرکے یہ بتایا ہے کہ پیغمبر ایک ہی ہوتا ہے اس کیلئے تقدم و تاخر کا سوال نہین،

ہندو مذہب کے اثر سے روشنیہ، الٰہیہ، اور تناسخیہ کے فرقے پیدا ہوئے، یوگ کی بڑی مقبولیت ہوئی، اور خانقاہون کی زندگی اس سے متاثر ہوئی، چشتیہ اور شطاریہ کے ذکر اور مراقبہ مین یہ ایک جزو ہوگیا، پروفیسر شوستری نے تصوف اور ویدانت کے حبس دم، دھیان گیان بیر اور گرو، ریاضت اور پرائچت، ذکر، معرفت، محبت حق تعالیٰ مین جو اشتراک ہے، اسکو دکھلایا ہے،

ہندوؤن نے مسلمانون سے بہت سے اثرات قبول کئے، ہندو مذہب کی اصلاحی تحریکین اور بھگتی کا نشو و نما مسلمانون ہی کے زیر اثر ہوا، ہندو مذہب اور اسلام کے فلسفہ کے تصادم سے پندرہوین صدی عیسوی تک ہندستان مین بہت سے نئے فرقے پیدا ہوگئے، ویدانت کی مختلف تعبیرون سے مختلف خیالات پھیلے جن مین رام نوج، مادھو، ولبھ کے خیالات زیادہ مشہور ہوئے، لیکن ان کے سارے اختلاف بھگتی کے سیلاب مین بہہ گئے،

ہندو اہل قلم مثلاً پران ناتھ (بیس گرہون کی بات) گنگا بشن کول (مجموعہ) بال کرشن برہمن حصاری (دمشق خابا) سدا سکھ نیاز (تنبیہ الغافلین) نے ہندوؤن کو مسلمانون کے اعتقادات کو روشناس کرنے کی کوشش کی،

کبیر، نانک، دادو، پران ناتھ، بابالال، جگ جیون داس، چرن داس نے تو ہندو مذہب مین بہت سے اسلامی عناصر پیدا کئے، ہندوؤن مین قدیم خیال کے رہنما کے بجائے نئے مذہبی پیشوا پیدا ہوئے، اسلامی طرز کے مرشد اور مرید کی طرح گرو اور چیلہ کی اہمیت زیادہ ہوگئی، ہندوؤن نے بھی فارسی تذکرون کی تقلید مین اپنے مذہبی پیشواؤن کے حالات قلمبند کئے، جس کی مثال سنسکرت مین نہ تھی،

"ص ع"

اخبار علمیہ

بنگال کی تعلیمی حالت

اس سال کلکتہ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد مین پانچ ہزار طلبہ کو ڈگریان ملین جو گذشتہ بیس سال کے مقابلہ مین سو فی صدی ترقی ہے، ۱۹۱۰ء مین میٹرک کے امتحان مین سات ہزار پانچ سو لڑکے پاس ہوئے تھے، ۱۹۳۰ء مین اکیس ہزار طلبہ کامیاب ہوئے، بیس سال مین ابتدائی تعلیم کے مدارس کی تعداد تیس ہزار پانچ سو سے ساٹھ ہزار تک پہونچ گئی ہے، لڑکون کی تعداد گیارہ لاکھ ساٹھ ہزار سے پچیس لاکھ چھیاسی ہزار تک بڑھ گئی ہے، لیکن ابتدائی مدارس مین جو طلبہ داخل ہوتے ہین، ان مین لڑکون مین ۱۲ فی صدی اور لڑکیون مین ۲/۵، ابتدائی تعلیم کی تکمیل کرتے ہین، تقریباً ۶۰ فی صدی لڑکے اور ۷۰ فی صدی لڑکیان پہلے سال ہی مین اسکول چھوڑ دیتی ہین، اسلئے ابتدائی مدارس ان کے لئے اتنے مفید نہین ہوتے جتنے کہ ہونے چاہئین، ابتدائی مدارس کے اساتذہ کی ماہانہ اوسط تنخواہ سات روپئے سے بھی کم ہوتی ہے، کچھ ایسے اساتذہ ہین جن کی تنخواہ بیس روپیہ سے تیس تک ہے، لیکن ہزارون اساتذہ ایسے ہین جن کی تنخواہ پانچ روپیہ سے بھی کم ہے، اتنی قلیل تنخواہ مین لائق اساتذہ کا ملنا ممکن نہین لیکن ابتدائی تعلیم سے دلچسپی روز بروز بڑھتی جاتی ہے، حکومت بنگال نے میونسپلٹیون کو یہ اجازت دی تھی کہ وہ ابتدائی تعلیم کی اشاعت زیادہ سے زیادہ کرین، لیکن ابتدائی تعلیم جبری نہیں بنائی گئی اس لئے بعض میونسپلٹیون نے تو ابتدائی تعلیم کے سلسلہ مین کافی جد وجہد کی، لیکن بعض نے توجہ نہین کی، ۱۹۲۹ء مین

گاؤن مین جبری ابتدائی تعلیم کا قانون پاس ہوا، اس کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے ایک تعلیمی ٹیکس بھی تجویز ہوا، لیکن یہ قانون عمل مین نہین آیا، اب گذشتہ تین سال سے اسکی طرف خاص توجہ کی گئی ہے ۱۹ اضلاع مین یہ قانون نافذ کر دیا گیا ہے، اور آٹھ اضلاع مین تعلیمی ٹیکس بھی لگا دیا گیا ہے، اگر یہ ٹیکس پورے صوبہ مین جاری ہوگیا، تو ایک کرور روپے کی آمدنی ہوگی، لیکن یہ رقم بھی کافی نہین، کیونکہ صوبہ کے تمام مدارس کے لئے دو لاکھ مدرسین چاہئین، مذکورۂ بالا رقم تو صرف انکی تنخواہ مین خرچ ہوجائیگی، لیکن جبری ابتدائی تعلیم سے اگر ایسی ہی دلچسپی لی گئی، تو جلد از جلد یہ مشکلات حل ہوجائینگی، حکومت مختلف ذرائع سے روپے کی فراہمی کی کوشش مین ہے،

بیس سال مین ثانوی اسکولون کی تعداد ڈیڑھ زیادہ ہوگئی، اور طلبہ کی تعداد بھی نصف سے زیادہ بڑھ گئی ہے، لیکن تعلیم کا معیار گھٹ گیا ہے، اور اب عام خیال یہ ہے کہ اب میٹرک پاس کرلینا پہلے سے بہت زیادہ آسان ہوگیا ہے، اسکولون کی مالی حالت اچھی نہین، اسلئے وہ لائق مدرسین کی خدمات حاصل نہین کرسکتے، مشکل سے کوئی ایسا اسکول ملے گا، جو معنوی حیثیت سے مغربی ممالک کے معیار کے مطابق ہو، میٹرک کا نصاب بدل دیا گیا ہے، اس لئے امید ہے کہ طلبہ کی قابلیت مین نمایان فرق ہوجائیگا، لیکن جب تک اسکول مین لائق، فارغ اور مطمئن مدرسین کا فقدان ہے، نصاب کا کامیاب ہونا مشکل ہے،

یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم مین خاطر خواہ ترقی ہوئی ہے، وہ مالی دقتون مین مبتلا نہین اسلئے مختلف شعبے کھلتے جارہے ہین، لیکن میٹرک کے امتحان کی آسانی کی وجہ سے عام طور سے لڑکے اچھے نہین نکلتے،

لڑکیون کی تعلیم مین بھی روز افزون ترقی ہورہی ہے، اب سے بیس برس پہلے صرف سو لڑکیان میٹرک کے امتحان مین شریک ہوئی تھین، لیکن گذشتہ سال تین ہزار سات سو شریک ہوئین لیکن لڑکیون کی تعلیم کا انتظام ابھی تک خاطر خواہ نہین، لڑکون کے بارہ سو اسکول کے مقابلہ مین لڑکیون کے اسکول صرف پچاسی ہین، کلکتہ سے باہر ان کے لئے کوئی ڈگری کالج نہین، (ماخوذ از اسٹیٹسمین مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۳۰ء)

ایتھر کا وجود

۱۸۸۱ء مین سائنس کے ماہرین نے اس تجربہ کے لئے زمین کی سمت روشنی کی دو شعاعین زاویۂ قائمہ کی شکل مین منعکس کین کہ اگر دنیا واقعی ایتھر کے سمندر سے ہوکر آفتاب کے گرد گھومتی ہے تو ان دو شعاعون مین سے ایک کی رفتار کم ہوجائے گی لیکن دونون شعاعین ساتھ ساتھ بڑھتی گئین اس تجربہ سے ایتھر کے متعلق شکوک پیدا ہوگئے، آئنسٹائن کے نظریون (۱۹۰۵ء-۱۹۱۵ء) نے بھی ایتھر کو سائنس دانون کا محض وہم قرار دیا، لیکن کلیولینڈ کے ایک پروفیسر نے ایتھر کے وجود سے انکار نہین کیا، اس نے روشنی کی شعاعون کا تجربہ پارے پر کیا، اور اس نتیجہ پر پہونچا کہ دنیا ایتھر کے سمندر سے ہوکر گھوم رہی ہے، اور اسکی رفتار ایک سکنڈ مین کئی سو میل ہے، مگر اس کا نظریہ عام طور سے قبول نہین کیا گیا،

آئنسٹائن جب نظریۂ اضافیت کو ترتیب دے رہا تھا، تو اسکی توجہ اس طرف ہوئی، کہ گھڑی جب بند ہونے لگتی ہے، تو اسکی رفتار اتنی سست پڑجاتی ہے، کہ اس کا پتہ چلانا بہت ہی مشکل ہوجاتا ہے سائنس کے ماہرین کا خیال ہے کہ ایسا ایتھر کی موجودگی کے سبب سے ہوتا ہے لیکن آئنسٹائن نے اس نظریہ کو قبول کرنے سے انکار کردیا، اور بتایا کہ یہ ایتھر کی موجودگی کی دلیل نہین بلکہ گھڑی کی رفتار کی سستی دیکھنے والے کے اضافی مشاہدہ کا نتیجہ ہے،

گذشتہ جنوری مین ایک ماہر طبعیات کا ایک مضمون "سائنس" مین نکلا ہے، اسمین آئنسٹائن کے خیالات پر سخت نکتہ چینی کیگئی ہے، اس نے آئنسٹائن کی ذہنی قابلیت اور کاوش کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ وہ سمجھنے مین غلطی کرسکتا ہے، اسلئے اس کا ایتھر سے انکار کرنا قابل تسلیم نہین، ایتھر کے وجود سے انکار نہین کیا جاسکتا، اس مضمون سے ماہرین طبعیات کے حلقہ مین کافی دلچسپی لیجارہی ہے،

"ض ع"

ادبیات

قصیدۂ تبریک

جس کو مولوی اقبال احمد خان صاحب سہیل ایم اے، ال ال بی، ایم ال اے نے جلسہ
شبلی انٹرمیڈیٹ کالج اعظم گڈھ مین جس کے صدر نشین نواب صدر یار جنگ مولینا حبیب الرحمن
خان شروانی سابق صدر الصدور دولت آصفیہ تھے، پڑھا گیا

قتیلِ ناوکِ عشقِ توام نمی دانی   کہ چارہ سازیِ دردم تو نیز نتوانی
ہمان زہر بُنِ مو شورِ العطش خیزد   ہزار خُم کدۂ وصلم ار بنوشانی
بہ ہجرت اشک بریزم ز جلوہ بگریزم   منم چو قطرۂ شبنم تو مہرِ تابانی
میانۂ من و تو ربطِ خاک و خورشید است   ز تو گریزم و گردِ خودم بگردانی
فرازِ مرتبۂ عشق نیک می دانم   ز ہرزہ ہا کہ سرودم خورم پشیمانی
چہ مہر و ماہ کہ بامِ بلند ہمتِ ماست   ہزار پایہ فزون تر ز کاخِ کیوانی
زمانہ دامنِ بختم بہ موجِ نکہت و خت   کہ ہست مایۂ آسایشم پریشانی
من از متاعِ دو عالم غمِ تو برچیدم   گذاشتم بہ ملک لذتِ تن آسانی
خرابِ تلخیِ زہرابۂ غمم کرد است   فلک کہ داشت بمن چشمِ لطفِ پنہانی
بہ نوشِ مشربِ من پے بُرد گر آبِ بقا   ز شرمِ او عرقش برچکد ز پیشانی
ز خاکِ مرقدم ار ذرۂ بیفشانند   جہان شود ہمہ زآبِ حیات طوفانی

دو صد بہشتِ معانی بہ سینہ پنہانست   مرا بہ دیدہ نہ گنجد بہشتِ رضوانی
فلک بدامنش آورد و ماہ و انجم ساخت   غبار ہا کہ برانگیختم بہ جولانی
بہ سینہ کاوی خود صد گہر برون فگنم   وزان یکے نہ فروشم بہ لعلِ رمّانی
چہ گنجہا کہ زیان کردم و ہنوز مرا   ز فیضِ طبع بود دعویِ بدخشانی
زکوٰۃِ خامہ بدر کردم و فلک می خواست   کہ قسمتش بہ سپارم بہ ابرِ نیسانی
ز پیکرے کہ دہم شاہدانِ معنی را،   ہزار رہ شکند رنگ بر رخِ مانی
مشامِ خلوتیانِ فلک شود شاداب   چو من ز خامہ فشانم رحیقِ ریحانی
شرابِ خم کدۂ فارس از لبم جوشد   اگرچہ من نہ صفاہانیم نہ کاشانی
ز بسکہ خردۂ جان می تراود از قلمم   نویدِ زندگیِ نو دہم بہ قاآنی
گمانِ خویش ستائی مبر کہ بود   مدیحِ من ہمہ راجع بہ ذاتِ نعمانی
گرت شگرفیِ نقشے در آورد بشگفت   رسد بہ خامۂ نقاش آفرین خوانی
ز یمنِ جرعۂ فیضانِ شبلی است کہ من   بہ قطرۂ بنویسم براتِ عمانی
ز فیضِ تربیتش این سہیل شد است   وگرنہ نا سرہ نقدم بہیچ نستانی
قضا کہ نظمِ دو عالم بدستِ قدرتِ اوست   بکشورِ ہنرش دادہ است سلطانی
حمامِ سدرہ نیارد کہ بال بکشاید   بہ وادیئ کہ کند ہمتش پر افشانی
مدادِ خامۂ او را بہ صورت و معنی   نشان دہند بہ ظلمات و آبِ حیوانی
فروغِ دیدۂ جانش ز جوہرِ اول   یکے ز مرتبۂ دانش معلمِ ثانی
حریفِ بزمِ کمالش ہذیلِ فارابی   گدائے خوانِ نوالش جریرِ خاقانی
روایتے ز کتابش صحیفۂ رازی   حکایتے ز خطابش کمالِ سحبانی

به نامه آئینه دارِ جلالِ **فاروقی** — به خامه شانه کشِ اجتهادِ نعمانی

چو سیرتِ نبوی بر نگاشت خامهٔ او — فرا گرفته جهان را بجلوه سامانی

ز مہرِ کبِ سعادت بر آستانهٔ او — نسیمِ روضهٔ رضوان کند مگس رانی

اگر جمالِ کمالش نقاب بر دارد — ز مهر و ماه ستاند خراجِ رخشانی

چو صبحدم شہِ خاور رسد به مرقدِ او — هزار سجده فرو باردش ز پیشانی

کنون که عالمِ نور است از رخش روشن — به خاکدانِ حریمش سزد سلیمانی

درین چمن که نوید بهار آمده است — رسیده است نسیمے ز فیضِ روحانی

به بختِ خویش بنازد بناے دانشگاه — که سایه بر سرش افگند شبلی ثانی

حریفِ بزمِ کہن ہم صفیرِ **نعمانی** — جنابِ صدرِ شریعت **حبیبِ شروانی**

جمالِ صورت و معنی فروغِ دانش و دین — که داغِ سجده همی تابدش به پیشانی

چکد ز رشحهٔ کلکش شرابِ مینائی — سزد بنغمهٔ نعتش خطابِ حسانی

چو دیده بر رخش افتد ز دل ندا آید — فرشته ایست مگر در لباسِ انسانی

ز بسکه خامهٔ تو جان دمد به قالبِ فن — زمانه نام نهادت مسیحِ دورانی

به اتقاے تو نازد شعارِ اسلامی — به اعتناے تو خندد بهارِ ایمانی

غلامِ شبلیم و ننگِ همتم باشد — به مدحِ اهلِ دول خامه را سبکرانی

مرا تو یوسفِ گم گشته ام بیاد آری — اگر ثناے تو گویم به آن تو شایانی

نجات نغمه طلبستم ز مرقدِ **شبلی** — چو آمدی سرِ بالین به فاتحه خوانی

تو عمِ مغتنمیم هستی و به ذاتِ تو باد
ترانه سنجی کلکِ **سہیل** ارزانی

مطبوعاتِ جدیدہ

اردو کے ہندو ادیب مؤلفہ جناب نظر کاکوروی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۰۵ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت اوسط قیمت عہ، پتہ انوار بک ڈپو لکھنؤ،

اردو زبان کی مخالفت مین ایک پروپیگنڈا یہ بھی کیا جا رہا ہے، کہ نہ وہ ہندوؤن کی زبان ہے اور نہ اس سے ان کو کوئی تعلق رہا ہے، اس خلافِ واقعہ بیان کے جوابات نہ صرف مسلمانون نے بلکہ حق پسند ہندوؤن نے بھی دیئے ہین، اسی سلسلہ مین مؤلف نے یہ کتاب لکھی ہے، اس مین ہر دور کے اردو زبان کے کئی سو ہندو شعراء کے حالات، ان کے ادبی خدمات اور ان کے کلام کے نمونے دیئے ہین اور اردو زبان کی تاریخ، اسکی وسعت و ہمہ گیری، لسانی مرکزیت، ہندوستانیت، ہندوؤن سے اس کے تعلق، اس کی نشو و نما مین ان کی کوششون اور اس موضوع کے دوسرے پہلوؤن پر بہت سے علمی و تاریخی شواہد، ہندو مسلمان اور دوسری قومون کے علماے اردو کی تحقیقاتون، رایون، اور سرکاری بیانات کو جمع کر دیا ہے، گو اس کتاب مین کوئی ایسی بات نہیں ہے، جو اس سے پہلے کہی اور لکھی نہ جا چکی ہو، تاہم مصنف نے ان متفرق معلومات کے تلاش و جمع کرنے مین کافی محنت کی ہے اور یہ کتاب اس غلط پروپیگنڈے کا اچھا جواب ہے، اگر مؤلف اور تلاش سے کام لیتے تو ان کو ہندو شعراء کے اور بہت سے نام ملجاتے، کتاب کی ترتیب البتہ بہت خراب ہے، اس کے پڑھنے مین الجھن ہوتی ہے، بعض مقامات پر دوسرون کے اقتباسات مؤلف کی عبارت سے مل گئے ہین،

اور بھی بعض خامیاں ہیں، جو بہرحال نقشِ اوّل میں ہونی ہی چاہئیں،

اصطلاحات پیشہ وراں، حصہ اوّل، مرتبہ جناب مولوی ظفر الرحمٰن صاحب دہلوی تقطیع اوسط، ضخامت، ۲۲ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۲ر پتہ انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی،

دوسری زبانوں کی طرح اردو میں بھی پیشہ وروں کی اصطلاحوں کا بہت بڑا ذخیرہ ہے جس کا بڑا حصہ صرف پیشہ وروں کی زبانوں پر ہے، اور لغت کی کتابیں ان سے خالی ہیں اور بغیر پیشہ وروں کی مدد کے اور ان اصطلاحوں کا مصداق دیکھے ہوئے ان کا سمجھنا بھی مشکل ہے، اسلئے ان کا جمع کرنا بڑا دشوار کام تھا، مولوی ظفر الرحمٰن صاحب کی یہ ہمت اور محنت قابل ستائش ہے کہ انھوں نے تمام پیشہ وروں سے مل کر ان سے اصطلاحوں کو سمجھکر برسوں کی محنت و تلاش سے اردو زبان میں اس لسانی ذخیرہ کا اضافہ کیا، اس حصہ میں صرف دس پیشوں کی اصطلاحیں ہیں، ہر اصطلاح کی پوری تشریح ہے، جابجا وضاحت کیلئے نقشے اور تصویریں بھی دیدی گئی ہیں، انجمن ترقی اردو نے یہ کتاب شائع کرکے اردو لغت میں بہت مفید اضافہ کیا ہے،

یورپ کی خونی سیاست مؤلفہ جناب تصور حسین صاحب ایم اے، تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۶ صفحے، کاغذ اچھا، کتابت و طباعت معمولی، قیمت ڈیڑھ آنے، پتہ:۔ کتاب گاہ دہلی،

یورپ کی موجودہ خونین سیاست، خالص خود غرضی اور دوسرے ملکوں کو مالِ غنیمت بنانے کے لئے برسوں کی باہمی رشک و رقابت کا نتیجہ ہے، جس کے سمجھنے کے لئے گذشتہ نصف صدی کے یورپ کے سیاسی نشیب و فراز کا جاننا ضروری ہے، لائق مؤلف نے اس کتاب میں اٹھارہویں صدی کے آخر سے جنگ بلقان تک مختصر اور اس کے بعد سے اس وقت تک کسی قدر تفصیل سے یورپ کی سیاست

پر اس طرح تبصرہ کیا ہے کہ یورپی سیاست کا مدوجزر، اس کے اسباب اور موجودہ نتائج نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں، کتاب کے آخر میں ماخذوں کا حوالہ بھی دیدیا ہے، اپنے موضوع کی وسعت کے اعتبار سے کتاب بہت مختصر ہے، لیکن مفید ہے،

سائنس کے کرشمے، مرتبہ جناب میر حسن صاحب ایم اے، تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت عہ مجلد، ادارۂ ادبیات اردو، رفعت منزل خیرت آباد، حیدرآباد دکن،

حیدرآباد ریڈیو پر روزانہ کے مشاہدات سے متعلق سائنس کے بعض معمولی مسائل اور مظاہر پر جو تقریریں ہوئیں انھیں اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے، اس میں ہوا، اور پانی کی ماہیت، ان کے خواص اور فوائد اور بجلی، ہوابازی، ٹیلی ویژن، کیمیائی جنگ اور ربر کی تاریخ و ترقی پر مختلف اشخاص کی چھ تقریریں ہیں،

یادگارِ جگر، مرتبہ جناب پانڈے سرسوتی پرشاد، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۱۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت نفیس، جلد خوبصورت، قیمت عہ، پتہ:۔ پانڈے سرسوتی پرشاد لائبریرین گورکھپور ہائی اسکول،

منشی رنگ بہادر لعل جگر گورکھپوری وسیم خیرآبادی کے تلامذہ میں ایک خوش مذاق اور خوش فکر شاعر تھے، ان کے انتقال کے بعد ان کے بھانجے پانڈے سرسوتی پرشاد نے یادگارِ جگر کے نام سے ان کے کلام کا مجموعہ شائع کیا ہے، اس کے شروع میں شاعر کے متعدد ہندو مسلمان احباب اور قدردانوں کے تبصرے اور تعارف ہیں، ان میں جناب فراق اور مجنوں گورکھپوری کے نام قابل ذکر ہیں، مصنف اپنے کلام کی جانب سے بہت لاپروا تھے، بلکہ اسکا بڑا حصہ انھوں نے خود ضائع کر دیا، اس لئے اس مجموعہ میں کل ۲۹ غزلیں ہیں، لیکن جو کچھ ہے وہ منتخب ہے، تخیل کی رنگینی اور طرز ادا کی شوخی کے اعتبار سے کلام تمامتر قدیم رنگ کا نمونہ ہے، لیکن اس خوش مذاقی کیساتھ کہ ذوقِ سلیم پر حرف نہیں آتا، شاعر کو زبان